دودھ کی قیمت

(افسانے)

پریم چند

(سٹوڈینٹس پریس دہلی)

دسمبر ۱۹۶۰ء

قیمت ایک روپیہ

ناشران

اُردو پاکٹ بک سیریز پوسٹ بکس نمبر ۱۲۹۳ دھلی

تقسیم کار

نیو تاج آفس پوسٹ بکس نمبر ۱۷۳۹ دہلی

فہرست

دودھ کی قیمت

اب بڑے بڑے شہروں میں دائیاں اور نرسیں بھی نظر آتی ہیں۔ لیکن دیہاتوں میں ابھی تک زچّہ خانہ روشِ قدیم کی طرح بھنگیوں کے ہی دائرۂ اقتدار میں ہے۔ اور ایک عرصہ دراز تک اس میں اصلاح کی کوئی امید نہیں۔ بابو مہیش ناتھ اپنے گاؤں کے زمیندار ضرور تھے تعلیم یافتہ بھی تھے، زچہ خانہ کی اصلاح کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتے تھے لیکن عملی مشکلات کو کیا کرتے۔ دیہات میں جانے کو کوئی نرس راضی بھی ہوئی تو ایسا معاوضہ طلب کیا کہ بابو صاحب کو سر جھکا کر چلے آنے کے سوا کوئی تدبیر نہ

سوجھی۔ لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے کی انہیں ہمت ہی کیونکر ہو سکتی۔ ان کا حق الخدمت تو غالباً بابو صاحب کی نصف ملکیت بیع ہونے پر بھی نہ پورا ہوتا۔ آخر جب تین لڑکیوں کے بعد یہ چوتھا لڑکا پیدا ہوا تو پھر وہی گوڈر تھا اور وہی گوڈر کی بہو۔ بچے بیشتر رات ہی کو پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ آدھی رات کو بابو صاحب کے چپراسی نے گوڈر! گوڈر کی ہانک لگائی کہ چاروں کی ایک ٹولی جاگ اٹھی۔

گوڈر کے گھر میں اس روز سعید کی بہنوں سے تیاری تھی۔ خدشہ تھا تو یہی کہ کہیں بیٹی نہ ہو جائے۔ نہیں تو پھر وہی بندھا ہوا ایک روپیہ اور وہی ایک ساڑھی مل کر رہ جائے گی۔ اس مسئلہ پر میاں بیوی میں بارہا تبادلہ خیالات ہو چکا تھا۔ شرطیں لگ چکی تھیں گوڈر کی بہو کہتی تھی کہ اگر اب کے بیٹا نہ ہوا تو منہ نہ دکھاؤں۔ ہاں ہاں۔ منہ نہ دکھاؤں اور گوڈر کہتا تھا کہ دیکھو بیٹی ہو گی۔ اور بیچ کھیت بیٹی ہو گی۔ بیٹا پیدا ہوا تو مونچھیں منڈوا لوں گا۔ شاید گوڈر سمجھتا تھا کہ اسی طرح بھنگی میں مخالفانہ جوش پیدا کر کے وہ بیٹے کی آمد کے لئے راستہ تیار کر رہا ہے۔

بھنگی بولی "اب منڈا لے مونچھیں ڈاڑھی جا۔ کہتی تھی بیٹا ہو گا، پر سُنے ہی نہیں۔ اپنی رٹ لگائے۔ خُد تیری مونچھیں مونڈ دوں گی۔ کھونٹی تو رکھوں نہیں ہیا!"

گوڈر نے کہا "اچھا مونڈ لینا بھلی مانس، مونچھیں کیا پھر نکلیں ہی نہیں تیسرے دن پھر دیکھے گی جوں کی توں ہیں۔ مگر جو کچھ ملے گا اس میں آدھا رکھ لوں گا۔ کہے دیتا ہوں!"

بھنگی نے انگوٹھا دکھایا۔ اور اپنے تین مہینے کے بچے کو گوڈر کے سپرد کر، سپاہی کے ساتھ چل دی۔

گوڈر نے پکارا "اری سُن تو۔ کہاں بھاگی جاتی ہے۔ مجھے بھی تو روشن چوکی بجانے جانا پڑے گا"۔

بھنگی نے دور ہی سے کہا "تو کون بڑی مشکل ہے۔ وہیں دھرتی پر لٹا دینا اور روشن چوکی بجانا۔ میں آکر دودھ پلا دیا کروں گی"۔

۲

مہیش ناتھ کے ہاں اب کے بھنگی کی خوب خاطر کی گئی۔ صبح کو حریرہ ملتا۔ دوپہر کو پوریاں اور حلوا۔ تیسرے پہر کو پھر اور رات کو پھر۔ اور گوڈر کو بھی بھرپور پروسا ملتا تھا۔ بھنگی اپنے بچے کو دن بھر میں دو بار سے زیادہ دودھ نہ پلا سکتی۔ اس کے لئے اوپر کا دودھ مہیا کر دیا جاتا۔ بھنگی کا دودھ بابو صاحب کا بچہ پیتا تھا۔ اور یہ سلسلہ بارہویں دن بھی نہ بند ہوا مالکن موٹی تازی عورت تھیں، مگر اب کی کچھ ایسا اتفاق کہ دودھ ہوا ہی نہیں۔ تینوں لڑکیوں کی بار اتنے افراط سے دودھ ہوتا تھا کہ لڑکیوں کو بدہضمی ہو جاتی تھی۔ اب کی ایک بوند نہیں۔ بھنگی جنائی بھی تھی اور دودھ پلائی بھی۔

مالکن نے کہا "بھنگی ہمارے بچے کو پال دے۔ پھر جب تک جئے بیٹھی کھاتی رہنا پانچ بیگھے معافی دلوا دوں گی۔ تیرے پوتے تک کھائیں گے"۔

اور بھنگی کا لاڈلا اوپر کا دودھ نہ ہضم کر سکنے کے باعث بار بار قے کرتا اور روز بروز لاغر ہوتا جاتا تھا۔ بھنگی کہتی "اور مونڈن میں چوڑے لوں گی بہوجی۔ کہے دیتی ہوں"!

بہوجی "ہاں ہاں چوڑے لینا بھائی۔ دھمکاتی کیوں ہے۔ چاندی کے لے گی، یا سونے کے؟

"واہ بہوجی واہ۔ چاندی کے جوڑے پہن کر کیسے منہ دکھاؤں گی؟"

"اچھا سونے کے لینا۔ابھی کہتی تو ہوں۔"

"در بیاہ میں کنٹھا لوں گی۔ اور چودھری (گوڈر) کے لئے ہاتھوں کے توڑے۔"

بہوجی: "وہ بھی لینا۔ وہ دن تو بھگوان دکھائیں۔"

گھر میں مالکن کے بعد بھنگی کی حکومت تھی۔ مہریاں، مہراجن، مزدور، سب اس کا رعب مانتی تھیں، یہاں تک کہ خود بہوجی اس سے دب جاتی تھیں۔ ایک بار تو اس نے مہیش ناتھ کو بھی ڈانٹا تھا۔ ہنس کر ٹال گئے۔ بات چلی تھی بھنگیوں کی۔ مہیش ناتھ نے کہا تھا "دنیا میں اور چاہے جو کچھ ہو جائے بھنگی بھنگی رہیں گے انہیں آدمی بنانا مشکل ہے۔"

اس پر بھنگی نے کہا تھا "مالک بھنگی تو بڑے بڑوں کو آدمی بناتے ہیں انہیں کیا کوئی آدمی بنائے گا۔"

یہ گستاخی کر کے کسی دوسرے موقعہ پر بھلا بھنگی سلامت رہتی۔ سر کے بال اکھاڑ لئے جاتے۔ لیکن آج بابو صاحب ہنسے۔ قہقہہ مار کر بولے۔

"بھنگی بات بڑے پتے کی کہتی ہے۔"

۳

بھنگی کی حکومت سال بھر تک قائم رہی پھر چھن گئی۔ بچے کا دودھ چھڑا دیا گیا۔ اب برہمنوں نے بھنگی کا دودھ پینے پر اعتراض کیا۔ موٹے رام شاستری تو پرائشچت کی تجویز کر بیٹھے۔ لیکن مہیش ناتھ احمق نہ تھے پھٹکار بتائی۔ پرائشچت کی خوب کہی آپ نے شاستری جی۔ کل تک اسی بھنگن کا خون پی کر پلا۔ اب پرائشچت کرنا چاہیے۔ واہ!"

شاستری جی بولے: "بے شک کل تک بھنگن کا خون پی کر پلا۔ گوشت

کھا کر پیا۔ یہ بھی کہہ سکتے ہو۔ لیکن کل کی بات کل تھی آج کی بات آج ہے۔ جگن ناتھ پور میں تو چھوت اچھوت سب ایک ساتھ کھاتے ہیں۔ مگر یہاں تو نہیں کھا سکتے۔ کچھ دن تک کھا لیتے ہیں بابو جی اور کیا کہیں۔ پوری تک نہیں رہ جاتے۔ لیکن اچھے ہو جانے پر تو نہیں کھا سکتے۔

"تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دھرم بدلتا رہتا ہے۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔"

"اور کیا! راجہ کا دھرم الگ پرجا کا دھرم الگ، امیر کا دھرم الگ، غریب کا دھرم الگ، راجے مہاراجے جو چاہیں کھائیں، جس کے ساتھ چاہیں کھائیں۔ جس کے ساتھ چاہیں شادی بیاہ کریں۔ ان کے لئے کوئی قید نہیں۔ راجہ ہیں۔ مگر ہمارے اور تمہارے لئے تو قدم قدم پر بندشیں ہیں۔ اس کا دھرم ہے۔" پرائشچت تو نہ ہوا۔ لیکن بھنگی سے اس کی سلطنت چھین لی گئی۔ برتن کپڑے، اناج اتنی کثرت سے ملے کہ وہ اکیلی نہ لے جا سکی۔ اور سونے کے جوڑے بھی ملے۔ اور ایک دو نہیں اور خوبصورت ساڑھیاں معمولی نین سکھ کی نہیں جیسی لڑکیوں کی بار ملی تھیں۔

۴

اسی سال چیچک کا زور رہا۔ گوڈر پہلے ہی زد میں آگیا۔ بھنگی اکیلی رہ گئی۔ مگر کام جوں کا توں چلتا رہا۔ بھنگی کے لئے گوڈر اتنا ضروری نہ تھا۔ جتنا گوڈر کے لئے بھنگی۔ لوگ منتظر تھے کہ بھنگی اب گئی اب گئی۔ فلاں بھنگی سے بات چیت ہوئی۔ فلاں چودھری آئے۔ لیکن بھنگی کہیں نہ گئی۔ یہاں تک کہ پانچ سال گزر گئے اور منگل دبلا، کمزور اور دائم المریض رہنے پر بھی دوڑنے لگا۔ ماں کا دودھ نصیب ہی نہ ہوا۔ دائم المریض کیوں نہ ہوتا۔

ایک دن بھنگی مہیش ناتھ کے مکان پر نالہ صاف کر رہی تھی۔ مہینوں

سے ملاقات جمع ہو گئی تھی۔ آنگن میں پانی بھرا رہنے لگا تھا۔ پرنالے میں ایک لمبا ہوا بانس ڈالی گر زور سے ہلا رہی تھی۔ بیبیرا داہنا ہاتھ پرنالے کے اندر تھا کہ یکا یک اس نے چلا کر ہاتھ باہر نکال لیا اور اسی وقت ایک لمبا سا کالا سانپ پرنالے سے نکل کر بھاگا۔ لوگوں نے دوڑ کر اسے تو مار ڈالا لیکن بھگی کو نہ بچا سکے۔ خیال تھا کہ پانی کا سانپ ہے زیادہ زہریلا نہ ہوگا۔ اس لئے پہلے کچھ غفلت کی گئی۔ جب زہر جسم میں پیوست ہوا اور لہریں آنے لگیں تب پتہ چلا کہ پانی کا سانپ نہیں کالا سانپ تھا۔

منگل اب یتیم تھا۔ دن بھر ہیش بابو کے دروازے پر منڈلایا کرتا۔ گھر میں اتنا جھوٹا بچا تھا کہ ایسے ایسے دس پانچ بچے سیر ہو سکتے تھے منگل کو کوئی تکلیف نہ تھی۔ ہاں دور ہی سے اسے مٹی کے ایک سکورے میں کھانا ڈال دیا جاتا اور گاؤں کے لڑکے اس سے دور دور رہتے تھے۔ یہ بات اسے اچھی نہ لگتی تھی۔ سب لوگ اچھے اچھے برتنوں میں کھاتے ہیں اس کے لئے مٹی کے سکورے! یوں اسے اس تفریق کا مطلق احساس نہ ہوتا لیکن لڑکے اسے چڑھا چڑھا کر اس ذلت کے احساس کو سان پر چڑھاتے رہتے تھے۔

مکان کے سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ اسی کے نیچے منگل کا ڈیرا تھا۔ ایک پھٹا پھٹا سا ٹاٹ کا ٹکڑا، دو سکورے اور ایک دھوتی جو ہیش بابو کے خوش نصیب فرزند سریش کے اتارے کپڑوں میں سے ایک تھی۔ جاڑا، گرمی برسات ہر موسم کے لئے وہ ایک سی آرام دہ تھی۔ یہی اس کی خصوصیت تھی۔ اور سخت جان منگل جھلستی ہوئی لو اور کڑاکے کے جاڑوں اور موسلا دھار بارش میں بھی زندہ تھا۔ اور تندرست تھا۔ لیکن اس کا کوئی رفیق تھا تو گاؤں کا ایک کتا جو اپنے ہم چشموں کی بدمزاجیوں اور تنگ ظرفیوں سے

عاجز آکر منگل کے ہمسایہ آپڑا تھا کھانا دونوں کا ایک تھا۔ کچھ طبیعت بھی یکساں تھی اور غالباً دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے بھی واقف ہو گئے تھے۔

منگل نے اس کا نام رکھا تھا ٹامی۔ مگر ٹامی ہمیشہ ناتھ کے انگریزی کتے کا نام تھا اس لیے اس کا نام کا استعمال وہ اسی وقت کرتا جب دونوں رات کو سونے لگتے۔

منگل کہتا "دیکھو ٹامی۔ ذرا اور کھسک کر سوؤ۔ آخر میں کہاں لیٹوں سارا ٹاٹ تو تم نے گھیر لیا" ٹامی کوں کوں کرتا اور دم ہلاتا۔ بجائے اس کے کہ کھسک جائے اور اوپر چڑھ جاتا اور منگل کا منہ چاٹنے لگتا۔ شام کو وہ ایک بار روز اپنا گھر دیکھنے اور تھوڑی دیر رونے جاتا۔ پہلے سال پھوس کا چھپر گرا۔ دوسرے سال ایک دیوار گری اور اب صرف آدھی آدھی دیواریں دیواریں کھڑی تھیں۔ جن کا اوپر کا حصہ نوکدار ہو گیا تھا۔ یہیں اسے محبت کی دولت ملی تھی۔ وہی مزا۔ وہی یاد۔ وہی کشش اسے ایک بار ہر روز اس ویرانے میں کھینچ لے جاتی۔ اور ٹامی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ کھنڈر کی مخروطی دیوار پر بیٹھ جاتا اور زندگی کے آنے والے اور گزشتہ خواب دیکھنے لگتا۔ اور ٹامی دیوار پر کود جانے کی بار بار ناکام کوشش کرتا۔

۵

ایک دن کئی لڑکے کھیل رہے تھے۔ منگل بھی پہنچ کر دور کھڑا ہو گیا۔ سریش کو اس پر رحم آیا یا کھیلنے والوں کی جوڑی پوری نہ پڑتی تھی کچھ بھی ہو، اس نے تجویز کی۔ کہ آج منگل کو بھی کھیل میں شریک کر لیا جائے یہاں

کون دیکھنے آتا ہے۔

سریش نے منگل سے پوچھا "کیوں رے کھیلے گا؟"

منگل بولا "کھلاؤ گے تو کیوں نہ کھیلوں گا"

سریش نے کہا "اچھا تو ہم تینوں سوار بنتے ہیں۔ تم ٹٹو بن جاؤ۔ پھر ہم لوگ تمہارے اوپر سوار ہو کر گھوڑا دوڑائیں گے

منگل نے پوچھا "میں برابر گھوڑا ہی رہوں گا کہ سواری بھی کروں گا"

یہ مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ سریش نے ایک لمحہ غور کر کے کہا "تجھے کون اپنی پیٹھ پر بٹھائے گا۔ سوچ آخر تو بھنگی ہے کہ نہیں؟"

منگل نے کسی قدر دلیر ہو کر کہا "میں کب کہتا ہوں کہ میں بھنگی نہیں ہوں لیکن جب تک مجھے بھی سواری کرنے کو نہ ملے گی میں گھوڑا نہ بنوں گا۔ تم سوار بنو گے اور میں گھوڑا ہی بنا رہوں گا؟"

سریش نے تحکمانہ لہجہ میں کہا "تجھے گھوڑا بننا پڑے گا" اس نے منگل کو پکڑنا چاہا۔ منگل بھاگا۔ سریش بھی دوڑا۔ منگل نے قدم اور تیز کیا۔ سریش نے بھی زور لگایا مگر بسیار خوری نے اسے تھل تھل بنا دیا تھا۔ اور دوڑنے سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔ آخر سریش نے رُک کر کہا "آکر گھوڑا بنو منگل۔ ورنہ کبھی پاؤں گا تو بری طرح پیٹوں گا"

"تمہیں بھی گھوڑا بننا پڑے گا"

"اچھا ہم بھی بن جائیں گے"

"تم بعد میں بھاگ جاؤ گے۔ اس لئے پہلے تم بن جاؤ میں سواری کر لوں پھر میں بنوں گا"

سریش نے چکمہ دیا۔ منگل کے اس مطالبہ نے برہم کر دیا ساتھیوں سے

بولا "دیکھو اس کی بدمعاشی کھنگی ہے" تینوں نے اب کی منگل کو گھیر لیا اور زبردستی گھوڑا بنا دیا۔ سریش اپنا وزنی جسم لے کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ اور ٹک ٹک کر کے بولا "چل گھوڑے چل" مگر اس بوجھ کے نیچے تڑپنا منگل کے لئے ہلنا بھی مشکل تھا۔ دوڑنا تو دور کی بات تھی ایک لمحہ تو وہ ضبط کئے چوپایہ بنا کھڑا رہا لیکن ایسا معلوم ہونے لگا کہ ڈیڑھ کی ہڈی ٹوٹی جاتی ہے۔ اس نے آہستہ سے پیٹھ سکوڑی اور سریش کی ران کے نیچے سے سرک گیا۔ سریش گدے سے گر پڑے اور بھونپو بجانے لگے۔ ماں نے سُنا سریش کیوں رو رہا ہے۔ گاؤں میں کہیں سریش روئے ان کی ذکی الحس کانوں میں ضرور آواز آجاتی تھی۔ اور اس کا رونا تھا بھی دوسرے لڑکوں سے بالکل نرالا۔ جیسے چھوٹی لائن کے انجن کی آواز

ایک منٹ میں سریش آنکھیں ملتا ہوا گھر میں آیا۔ آپ کو جب کبھی رونے کا اتفاق ہوتا تھا تو گھر میں فریاد لے کر ضرور آتے تھے۔ ماں چپ کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ دے دیتی تھی۔ آپ تھے تو آٹھ سال کے، مگر بہت بیوقوف، حد سے زیادہ پیارے۔ ماں نے پوچھا "کیوں رو رہا ہے سریش؟ کس نے مارا؟" سریش نے روتے ہوئے کہا "منگل نے چھوا دیا"

پہلے تو ماں کو یقین نہ آیا لیکن جب سریش قسمیں کھانے لگا تو یقین لانا لازم ہو گیا۔ اُس نے منگل کو بلوایا۔ اور ڈانٹ کر بولی "کیوں رے منگلوا۔ اب تجھے بدمعاشی سوجھنے لگی۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ سریش کو چھونا نہیں۔ یاد ہے کہ نہیں؟ بول" منگل نے دبی آواز سے کہا "یاد ہے"

"تو پھر تو نے اسے کیوں چھوا؟... تو نے نہیں چھوا تو یہ روتا کیوں تھا؟"

"یہ گر پڑے اس لئے رونے لگے"

"چوری اور سینہ زوری" دیوی دانت پیس کر رہ گئیں۔ مارتیں تو اسی وقت اشنان کرنا پڑتا۔ تھپی تو ہاتھ میں لینا ہی پڑتی اور چھوت کی برقی رَو تھپی کے راستہ ان کے جسم میں سرایت کر جاتی۔ اس لئے جہاں تک گالیاں دے سکیں دیں اور حکم دیا کہ "اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔ پھر جو تیری صورت نظر آئی تو خون ہی پی جاؤں گی۔ مفت کی روٹیاں کھا کھا کر شرارت سوجھتی ہے۔

منگل میں غیرت تو کیا ہوگی خوف تھا۔ چپکے سے اپنے سکورے اٹھائے ٹاٹ کا ٹکڑا بغل میں دبایا، دھوتی کندھے پر رکھی اور روتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ یہی تو ہوگا کہ بھوکوں مر جائے گا۔ کیا حرج ہے؟ اس طرح جینے سے فائدہ ہی کیا۔ گاؤں میں اور کہاں جانا۔ بھنگی کو کون پناہ دیتا۔ وہی اپنے بے در و دیوار کی آڑ تھی۔ جہاں پچھلے دنوں کی یادیں اس کے آنسو پونچھ سکتی تھیں۔ وہیں جاکر پڑ رہا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ ٹامی بھی اسے ڈھونڈتا ہوا آپہنچا۔

۶

لیکن جوں جوں شام ہوتی گئی اس کا احساس ذلت بھی غائب ہوتا گیا۔ بچپن کی بیتاب کرنیوالی بھوک جسم کا خون پی پی کر اور بھی بے پناہ ہوتی جاتی تھی۔ آنکھیں بار بار سکوروں کی طرف اٹھ جاتیں۔ اس نے مشورتاً ٹامی سے کہا۔ کھاؤ گے کیا، میں تو بھوکا ہی لیٹ رہوں گا۔ ٹامی نے کوں کوں کرکے شاید کہا۔ اس طرح کی ذلتیں تو ساری زندگی سہنی ہیں۔ پھر ذرا دیر کے بعد دُم ہلاتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ ہماری زندگی اسی لئے ہے بھائی!

منگل بولا "تم جاؤ جو کچھ مل جائے کھالو میری پروا نہ کرو۔" بابو جی نے پھر اپنی سنگستانی بولی میں کہا "اکیلا نہیں جاتا۔ تمہیں ساتھ لیکر چلوں گا۔" ایک لمحہ بعد بھوک نے تالیف کا ایک نیا پہلو اختیار کیا "مالکن تلاش کر رہی ہوں گی۔ کیوں نامی؟" اور "کیا بابو جی اور سریش کھا چکے ہوں گے کہار نے ان کی تھالی کا جھوٹا نکال لیا ہوگا اور ہمیں پکار رہا ہوگا۔" "بابو جی اور سریش دونوں کی تھالیوں میں گھی اور وہ میٹھی میٹھی چیز۔ ہاں ملائی ہماری آواز نہ شنائی دے گی تو سب کا سب گھورے پر ڈال دیں گے۔ ذرا دیکھ لیں کہ ہمیں کوئی پوچھنے آتا ہے۔" "یہاں کون پوچھنے آئیگا۔ کوئی برہمن ہو۔" "اچھا تو چلو وہیں چلیں مگر چھپے ہوئے رہیں گے۔ اگر کسی نے نہ پکارا تو میں لوٹ آؤں گا۔ یہ سمجھ لو۔"

دونوں وہاں سے نکلے اور آکر مہیش ناتھ کے دروازے پر ایک کونے میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔ ٹامی شاید ادھر اُدھر کی خبر لانے چلا گیا۔ مہیش بابو تھالی پر بیٹھ گئے تھے۔ نوکر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا "آج منگلوا نہیں دکھائی دیتا۔ بھوکا ہوگا بچارا۔ مالکن نے ڈانٹا تھا اسی لئے بھاگا ہے شاید۔" منگل کے جی میں آیا چل کر اس آدمی کے قدموں پر گر پڑے۔ دوسرے نے جواب دیا "اچھا ہوا نکالا گیا نہیں تو سبیرے سبیرے بھنگی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔" منگل اور اندھیرے میں کھسک گیا اب کیا امید کی جا سکتی تھی۔ مہیش اور سریش تھالی سے اٹھ گئے۔ نوکر ہاتھ منہ دھلا رہا ہے۔ اب بابو جی حقہ پئیں گے۔ سریش سوئے گا۔ غریب منگل کی کسے فکر ہے۔ اتنی دیر ہو گئی کسی نے نہیں پکارا۔ کون پکارے گا۔ منگل آدھ گھنٹے تک وہیں دبکا رہا۔ کسی نے اس کا نام نہ لیا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی

اور جانا ہی چاہتا تھا کہ اس نے اسی کہار کو ایک تھال میں جوٹھا کھانا لے جاتے دیکھا شاید گھورے پر ڈالنے جا رہا تھا۔ منگل اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آ گیا۔ اب صبر نہ ہو سکتا تھا کہار نے کہا "ارے تو یہاں تھا ہم نے کہا کہیں چلا گیا۔ لے کھالے میں پھینکنے لے جا رہا تھا۔" منگل نے کہا۔ میں تو بڑی دیر سے یہاں کھڑا تھا۔" کہار نے کہا "تو بولا کیوں نہیں؟" منگل بولا "ڈر لگتا تھا۔" منگل نے کہار کے ہاتھ سے تھال لے لیا اور اسے ایسی نظر سے دیکھا جس میں شکریہ اور احسان مندی کی ایک دنیا چھپی ہوئی تھی پھر وہ دونوں نیم کے درخت کے نیچے حسب معمول کھانے لگے۔ منگل نے ایک ہاتھ سے ٹامی کا سر سہلا کر کہا "دیکھا پیٹ کی آگ ایسی ہوتی ہے۔ لات کی ماری ہوئی روٹیاں بھی نہ ملتیں تو کیا کرتے۔ ٹامی نے دُم ہلائی۔ "سریش کو اماں ہی نے پالا ہے ٹامی۔" ٹامی نے پھر دُم ہلا دی "لوگ کہتے ہیں دودھ کا دام کوئی نہیں چکا سکتا۔" ٹامی نے پھر دُم ہلا دی۔ "اور مجھے دودھ کا یہ دام مل رہا ہے۔" ٹامی نے پھر دُم ہلا دی۔

کُسم

سال بھر کی بات ہے۔ ایک دن شام کو ہوا خوری کے لئے جا رہا تھا کہ مسٹر شاطر سے ملاقات ہو گئی۔ میرے پرانے دوست ہیں۔ نہایت بے تکلف اور زندہ دل، آگرہ میں قیام رکھتے ہیں۔ خوش گو شاعر ہیں۔ ان کی بزمِ سخن میں کئی بار شریک ہو چکا ہوں۔ ایسا فنانی الشعر آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ پیشہ تو وکالت ہے مگر غرق رہتے ہیں فکرِ سخن میں، چونکہ ذہین آدمی ہیں۔ معاملہ کی تہ تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی مقدمات مل جاتے ہیں لیکن لیکن کچہری کے باہر عدالت یا مقدمہ کا ذکر [illegible] کے لئے ممنوع ہے۔ عدالت کی

چار دیواری کے اندر پانچ گھنٹے وہ وکیل ہوتے ہیں۔ چار دیواری کے باہر نکلتے ہی شاعر ہیں۔ جب دیکھئے شعر وسخن کے چرچے ہو رہے ہیں۔ اشعار سُن رہے ہیں۔ داد دے رہے ہیں جھوم رہے ہیں۔ اور اپنا کلام سُناتے وقت تو ان پر بلا مبالغہ وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لہجہ بھی اتنا دل پذیر ہے کہ بے اختیار اشعار جگر میں چبھ جاتے ہیں۔ روحانیات میں شعریت پیدا کرنا۔ تصوف میں گُل وچمن کی بہار دکھانا ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔

وہ جب لکھنؤ آتے تھے پہلے اطلاع دے دیا کرتے تھے۔ آج انہیں لکھنؤ میں غیر متوقع دیکھ کر مجھے تعجب ہوا میں نے پوچھا "خیریت تو ہے۔ آپ یکایک یہاں کیسے نمودار ہوئے۔ مجھے اطلاع تک نہ دی۔

بولے "بھائی جان بڑی پریشانی میں مبتلا ہوں۔ آپ کو اطلاع دینے کا موقعہ نہ تھا۔ پھر آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ اس تکلّف کی کیا ضرورت کہ آپ میرے لئے کوئی خاص اہتمام کریں۔ میں ایک اشد ضروری معاملہ میں آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں۔ اس وقت ہوا خوری ملتوی کیجئے اور چل کر میرا قصۂ غم سُنئے"۔

"آپ نے تو مجھے وحشت میں ڈال دیا۔ آپ اور قصۂ غم۔ مجھے تو وحشت ہوتی ہے"۔

"چلئے اطمینان سے بیٹھوں تو سُناؤں"۔

ہم دونوں گھر کی طرف چلے۔

منہ ہاتھ دھو کر، شربت پانی اور پان الائچی کے بعد مسٹر شاطر نے اپنی داستان کھولنا شروع کی۔

"کسُم کی شادی میں تو آپ تشریف لے گئے تھے۔ اس سے قبل بھی آپ

نے اُسے دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک سلیم الطبع نوجوان کی کشش کے لئے جن لوازمات کی ضرورت ہے وہ سب اس میں کافی سے زیادہ موجود ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے گرمجوشی کے ساتھ کہا: "میں آپ سے کہیں زیادہ کلثم کا مداح ہوں ایسی سلیقہ شعار، باحیا، متین، خوش مزاج اور حسین لڑکی میں نے نہیں دیکھی"

شاہ صاحب نے مایوسانہ تبسم کے ساتھ فرمایا: "وہی کلثم اپنے شوہر کی بے اعتنائی کے باعث رو رو کر مری جاتی ہے۔ اُس کی رخصتی ہوئے ایک سال ہو رہا ہے۔ اس دوران میں دو تین بار سسرال گئی لیکن اس کا شوہر اس سے مخاطب ہی نہیں ہوتا۔ اس کی صورت سے بیزار ہے۔ میں نے ہر چند چاہا اُسے بلا کر دریافت حال کروں۔ مگر میرے خطوط کا نہ جواب دیتا ہے نہ آتا ہے۔ نہ جانے ایسی کیا بات ہو گئی کہ اس نے یہ روش اختیار کی۔ اب سنتا ہوں اس کی دوسری شادی ہونے والی ہے۔ کلثم کا بُرا حال ہو رہا ہے آپ شاید اُسے دیکھ کر پہچان بھی نہ سکیں۔ شب و روز رونے کے سوا اُسے کوئی کام نہیں ہے۔ اس سے آپ ہماری پریشانی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ زندگی کی پیاری آرزوئیں پامال ہوئی جاتی ہیں۔ ہمیں پرماتما نے کوئی لڑکا نہ دیا۔ مگر ہم اپنی کلثم کو پاکر اس کا شکر کرتے تھے۔ اسے کتنی نازونعم سے پالا۔ کبھی اس کو پھول کی چھڑی سے بھی نہ چھوا۔ اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ اس نے بی، اے پاس نہیں کیا لیکن خیال کی وسعت اور معلومات میں وہ کسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ عورت سے کم نہیں۔ آپ نے اس کے مضامین دیکھے ہیں۔ اس نے مباحثہ کئے ہیں۔ خانہ داری میں وہ اتنی ہوشیار ہے کہ میرے گھر

کا قریب قریب سارا انتظام اس کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن اپنے شوہر کی نگاہ میں وہ دنیا کی بدترین عورت ہے۔ بار بار پوچھتا ہوں تو نے اُسے کچھ کہہ دیا ہے یا کیا بات ہے؟ آخر وہ تجھ سے کیوں برگشتہ خاطر ہے۔ کلثم اس کے جواب میں دو کریہی کہتی ہے کہ مجھ سے تو انہوں نے کبھی کوئی بات چیت ہی نہیں کی۔ وہ پہلے دن ذرا دیر کے لئے کلثم کے پاس آیا تھا میرا خیال ہے کہ اس نے کلثم سے کوئی سوال کیا ہوگا اس نے شرم کے باعث کوئی جواب نہ دیا ہوگا۔ میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ اس نے دو چار بار وہی سوال کیا ہوگا کلثم نے سر نہ اُٹھایا ہوگا۔ آپ جانتے ہی ہیں، وہ کتنی شرمیلی ہے۔ بس حضرت روٹھ گئے ہوں گے۔ میں تو گمان ہی نہیں کر سکتا کہ کلثم جیسی لڑکی سے کوئی مرد بے اثر رہ سکتا ہے لیکن طبیعت کی اُفتاد کا کوئی کیا کرے؟ غریب نے اپنے شوہر کے نام متعدد خطوط درد اور سوز میں ڈوبے ہوئے لکھے مگر اس ظالم نے اس کے خطوط کا کبھی جواب نہ دیا۔ سب ہی خطوط واپس کر دئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سنگدل کو کیسے نرم کروں۔ میری غیرت تو تقاضا نہیں کرتی کہ خود اس کے پاس کچھ لکھوں۔ اب آپ سے یہی التجا ہے کہ اس معاملہ میں میری امداد کیجئے۔ ورنہ غریب کلثم مر جائیگی۔ اور اس کے بعد ہم دونوں بھی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ اس کی کوفت اب نہیں دیکھی جاتی۔"

شاطر کی آنکھیں پر آب ہو گئیں میں بھی بہت متاثر ہوا۔ سرگرمی سے بولا "میں آج ہی مراد آباد جاؤں گا۔ اور اس خرد ماغ لونڈے کی بری طرح خبر لوں گا۔ کہ وہ بھی یاد کریگا۔ بچہ کو زبردستی گھسیٹ کر لاؤں گا اور کلثم کے پیروں پر گرا دوں گا۔"

شاطر صاحب میری اس خود اعتمادی پر مسکرا کر بولے "کیا کہیں گے

اُس سے ؟"

"یہ نہ پوچھئے۔ تالیف قلب کے جتنے نسخے ہیں ان سبھی کی آزمائش کر دیکھا۔"

"تو آپ کو مطلق کامیابی نہ ہوگی۔ وہ اتنا خلیق، اتنا خندہ رو، اتنا منکسر المزاج اتنا شیریں زبان ہے کہ آپ وہاں سے اس کے مداح ہو کر لوٹیں گے۔ وہ ہر وقت دست بستہ آپ کے روبرو کھڑا ہوگا۔ آپ کی ساری تندی اور تیزی فرو ہو جائیگی۔ آپ کے قلم کو خدا نے کمال عطا کیا ہے آپ نے صد ہا نوجوانوں کے قلب کی تالیف کی ہے۔ دل میں درد پیدا کرنا آپ کا حصّہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کسم کی جانب سے ایک ایسا دردناک ایسا دل ہلا دینے والا خط لکھیں کہ وہ نادم ہو جائے۔ اور اس کے دل میں سویا ہوا انسان جاگ پڑے۔ میں آپ کا تا زیست ممنون رہوں گا۔"

مسٹر شاطر شاعر ہی تو ٹھہرے۔ اس تجویز میں بھی شعریت کا عنصر غالب تھا۔ آپ میرے کئی قصے پڑھ کر رو پڑے ہیں۔ اس سے آپ کو یقین ہو گیا ہے کہ میں جس دل کو چاہوں متاثر کر سکتا ہوں۔ آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ہر شخص شاعر نہیں ہوتا اور نہ یکساں رقیق القلب۔ جن قصوں کو پڑھ کر شاطر صاحب روئے ہیں اُن ہی قصوں کو کتنے ہی حضرات نے سنٹی منٹل کہہ کر کتاب پھینک دی ہے۔ مگر اس وقت ان نکتہ چینیوں کا موقعہ نہ تھا۔ وہ سمجھتے میں اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں اس لئے میں نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ "آپ کی تجویز سے مجھے پورا اتفاق ہے اور اگرچہ میرے خیال میں آپ نے امکانات کا مبالغہ آمیز اندازہ کیا ہے لیکن میں سے آپ کا انتظار جہاں تک ہو سکے گا اظہارِ درد کے ساتھ لکھ کے۔ مطابق ہی متحرف کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اگر آپ۔ تحریر آپ خط لکھیں وہ پہلے مجھے دو خطوط

دکھا دیں جو کسم نے اپنے شوہر کے نام لکھے تھے اس نے خطوط تو لوٹا ہی دیئے تھے اگر کسم نے پھاڑ نہ ڈالے ہوں گے تو وہ چٹھیاں ضرور اس کے پاس ہوں گی۔ ان خطوط سے مجھے معلوم ہو جائے گا کہ کن پہلوؤں پر لکھنے کی گنجائش باقی ہے"۔

مسٹر شاطر نے جیب سے خطوط کا ایک پلندا نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور بولے "میں سارے خطوط لیتا آیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ آپ ان خطوط کو دیکھنا چاہیں گے۔ آپ انہیں شوق سے دیکھیں۔ کسم جیسی میری لڑکی ہے ویسی ہی آپ کی بھی لڑکی ہے۔ آپ سے کیا پردہ ہے"۔

میں نے خطوں کو پڑھنا شروع کیا۔ گلابی کاغذ پر بہت خوشخط لکھے ہوئے معطر خط تھے۔

پہلا خط

میرے آقا! مجھے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا لیکن آنکھیں نہیں جھپکیں، ساری رات کروٹیں بدلتے گذر جاتی ہے۔ بار بار سوچتی ہوں مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی کہ آپ مجھے یہ سزا دے رہے ہیں۔ آپ مجھے جھڑکیں، کوسیں، مزاج چاہے تو میری گوشمالی بھی کریں۔ میں ہر ایک سزا برداشت کر لوں گی لیکن یہ بے اعتنائی مارے ڈالتی ہے۔ میں آپ کے یہاں ایک ہفتہ رہی میرا پرماتما جانتا ہے کہ میرے دل میں کیا کیا ارمان تھے میں کتنے اضطراب سے دن بھر ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہتی تھی۔ کتنی بار کوشش کی کہ آپ سے پوچھوں، آپ سے اپنی خطاؤں کی معافی کی التجا کروں لیکن آپ میرے سائے سے بھی دور بھاگے تھے۔ اور کوئی موقعہ نہ ہاتھ آیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جمعہ دوپہر کو سارا گھر سو جاتا تھا تو میں آپ کے کمرے میں جاتی تھی اور

گھنٹوں سر جھکائے کھڑی رہتی تھی۔ مگر آپ نے کبھی التفات نہ کیا۔ آپنے
مجھے نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوجاتی
تھی اُس کا شاید آپ اندازہ نہ کر سکیں گے میری جیسی بدنصیب عورتیں اس
کا کچھ اندازہ کر سکتی ہیں۔ میں نے اپنی سہیلیوں سے ان کی عروسی کے تذکرے
سُن سُن کر جو خیالی جنت بنا لی تھی اسے آپ نے کتنی بے دردی سے منہدم
کردیا۔ کیا میرا آپ پر کوئی حق نہیں ہے؟ عدالت بھی کسی مجرم کو سزا دیتی
ہے تو اس پر فرد جُرم لگا دیتی ہے۔ آپ نے اتنی عنایت بھی نہ کی۔ مجھے خطا
معلوم ہو جاتی تو آئندہ کے لئے سنبھل جاتی میں آپ کے پیروں پر گر کر اپنی
خطائیں معاف کراتی ہوں۔ میں آپ سے حلفاً کہتی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں
معلوم کہ مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی۔ ممکن ہے آپ نے اپنی بیوی میں جن
اوصاف کے دیکھنے کی تمنا کی ہو وہ مجھ میں نہ ہوں۔ بے شک میں انگریزی
بہت کم پڑھی ہوں۔ میں انگریزی سوسائٹی کے آداب و قواعد سے
واقف نہیں۔ میں اپنی خامیوں سے ناواقف نہیں ہوں۔ میں تسلیم کرتی
ہوں کہ میں آپ کے لائق نہ تھی۔ آپ کو مجھ سے کہیں زیادہ حسین، باسلیقہ
اور روشن طبع نازنین ملنی چاہئے تھی لیکن سزا خطاؤں کی ملنی چاہئے
نہ کہ خامیوں کی پھر میں تو آپکے اشارے پہ چلنے کیلئے تیار ہوں آپ میری دلجوئی کریں پھر دیکھیں
کہ میں اپنی خامیوں کو کتنی جلدی پورا کر لیتی ہوں۔ آپکی نگاہِ محبت مجھے چمکا دیگی میرے ذہن کو
جولانی کریگی۔ مجھ میں قوتِ بیان پیدا کر دیگی میرے لئے نگاہ معجزہ ثابت ہوگی مگر میرے پیارے
آقا۔ آپکی یہ بے رحمی میرے دل و دماغ کو فنا کئے ڈالتی ہے۔ میرا دل بہت کمزور ہے۔ میں
اس عتاب کی متحمل نہیں ہو سکتی اور کیا عرض کروں۔ براہ کرم ایک روز کے لئے چلے آئیے
ایک بے گناہ کو رُلا کر آپ کو حسرت کے سوا کچھ نہ ہاتھ آئے گا۔ مجھ

میں سو عیب ہوں۔ مگر مجھے دعویٰ ہے کہ آپ کی جو خدمت میں کر سکتی ہوں، حقیقی پرستش میں کر سکتی ہوں وہ کوئی دوسری عورت نہیں کر سکتی۔ آپ عالم و فاضل ہیں۔ طبائع انسانی کے ماہر ہیں، بیدار مغز ہیں۔ آپ کی لونڈی آپ کے روبرو کھڑی نگاہِ کرم کی بھیک مانگ رہی ہے۔ کیا اس کے سوال کو ٹھکرا دیجیے گا؟

آپ کی خطا وار۔ کسم۔

میں یہ خط پڑھ کر بے انتہا متاثر ہوا۔ مجھے اس خیال سے اشتعال پیدا ہوا کہ ایک حسینہ اپنے شوہر کے روبرو اتنا عجز و انکسار کیوں کرے؟ مرد کو اگر عتاب کی آزادی ہے تو عورت کو وہ آزادی کیوں نہیں۔ یہ ظالم سمجھتا ہے کہ شادی نے ایک عورت کو غلام بنا دیا وہ اس کے ساتھ جتنا چاہے ظلم کرے؟ کوئی اس سے بازپرس نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی دوسری تیسری شادی کر سکتا ہے۔ عورت سے کوئی تعلق نہ رکھ کر اس پر اسی سختی سے حکومت کر سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ عورت پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسے رو رو کر مر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر اسے خوف ہوتا کہ عورت بھی اس کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں، اینٹ سے بھی نہیں محض تھپڑ سے دے سکتی ہے تو اسے کبھی اس بدمزاجی کی جرأت نہ ہوتی۔ غریب عورت کتنی مجبور ہے! شاید میں کسی کی جگہ ہوتا تو اس کی بےاعتنائی کا جواب اس کی وہ چند بے نیازی سے دیتا۔ میں اس کی چھاتی پر مونگ دلتا۔ زمانہ کے ہنسنے کی مطلق پرواہ نہ کرتا۔ جو زمانہ اتنا ظلم روا رکھ سکتا ہے اور زبانِ احتیاج نہیں کھولتا۔ اس کے ہنسنے اور رونے کی مجھے مطلق پرواہ نہ ہوتی۔ یہ وہ زمانہ ہے جس کی یادِ شیریں زندگی میں

مٹھاس پیدا کر دیتی ہے۔ جس کے ایک ایک دن پہ ایک ایک عمر قربان کی جا سکتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مرد عورت پر نثار ہوتا ہے اس کی پرستش کرتا ہے اور عورت کے دل پر اتنا پائیدار نقش مرقسم کر دیتا ہے کہ وہ اس کے سارے مظالم کو ہنس کر برداشت کرتی ہوئی اس کی خدمت میں عمر گذار دیتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب الفت کی بہار آتی ہے اور دلوں میں نئی نئی کونپلیں جنم لینے لگتی ہیں۔ اس موسم میں کون ایسا بے رحم ہے کہ درخت پر تیر چلائے گا۔ یہ اخلاقی جرم ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب صیّاد طائر کو اس کے نشیمن سے نکال کر پنجرے میں بند کر دیتا ہے۔ کیا وہ اس کی گردن پر چھری چلا کر اس کا نغمۂ شیریں سننے کی ہوس رکھتا ہے؟ ہاں یہ وہ زمانہ ہے جب دو مسافر منزلِ حیات میں باہم رفیق بن جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو آسائش پہنچانے کی ذمّہ داری دونوں پر برابر ہے اگر ایک جو زیادہ طاقتور ہے اپنے کمزور رفیق پر رفاقت کے پہلے ہی چند لمحوں میں رُعب جمانا شروع کرے تو منزل کا خدا ہی حافظ ہے۔

پھر میں نے دوسرا خط پڑھنا شروع کیا۔

دوسرا خط

"میرے سرتاج! دو ہفتے تک جواب کا انتظار کرنے کے بعد آج پھر یہ شکوہ نامہ لکھنے بیٹھی ہوں۔ جس وقت میں نے وہ خط لکھا تھا میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کا جواب ضرور آئے گا۔ امید کے خلاف اُمید کر رہی تھی۔ میرا دل اب بھی اُسے قبول نہیں کرتا کہ آپ نے عمداً جواب نہیں دیا۔ غالباً آپ کو فرصت نہیں ملی یا خدانخواستہ آپ کی طبیعت تو ناساز نہیں ہے۔ کس سے پوچھوں؟ اس خیال سے ہی میرا دل کانپتا ہے۔ میری ایشور

سے یہی التجا ہے کہ آپ خوش و خرم ہوں۔ مجھے خط نہ لکھیں نہ سہی میں رو کر خاموش ہی تو ہو جاؤں گی۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے اگر آپ کی طبیعت ذرا بھی مضمحل ہو تو مجھے فوراً خط لکھئے میں کسی کو ہمراہ لے کر آؤں گی۔ تکلف اور رواج سے میری طبیعت گھبراتی ہے ایسی حالت میں بھی اگر آپ مجھے اپنی خدمت سے محروم رکھتے ہیں تو آپ میرا وہ حق مجھ سے چھین رہے ہیں جو میری زندگی کی سب سے عزیز چیز ہے۔ میں آپ سے اور کوئی درخواست نہیں کرتی۔ آپ مجھے موٹے سے موٹا کھلائیے۔ موٹے سے موٹا پہنائیے۔ مجھے ذرا بھی شکایت نہ ہو گی۔ آپ کے ساتھ میں بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی خوش رہوں گی۔ مجھے زیور کی ہوس نہیں، محل میں رہنے کی تمنا نہیں سیر تماشے کا شوق نہیں۔ میری زندگی کا منشا آپ کی خدمت ہے۔ یہی اس کا ماحصل ہے۔ میرا دنیا میں کوئی دیوتا نہیں، کوئی گورو نہیں، کوئی حاکم نہیں میرے دیوتا آپ ہیں، میرے گورو آپ ہیں، میرے حاکم آپ ہیں۔ مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے مجھے ٹھکرائیے نہیں، میں محبت اور خدمت کے پھول لئے، عصمت اور وفا کی نذر دامن میں بھرے پجارن کی طرح آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مجھے ان پھولوں کو، اس نذر کو اپنے قدموں پہ رکھنے دیجئے۔ پجارن کا کام تو پوجا کرنا ہے۔ دیوتا اس کی پوجا قبول کرتا ہے یا نہیں، یہ سوچنے کی اسے کہاں فرصت ہے۔ میرے آقا! شاید آپ کو معلوم نہیں، میری آج کل کیا کیفیت ہے اگر معلوم ہوتا تو آپ ہرگز اس سرد مہری کا برتاؤ نہ کرتے۔ آپ مرد ہیں، آپ کے دل میں رحم ہے، وسعت ہے دلا وری ہے۔ میں یہ باور نہیں کر سکتی کہ آپ مجھ جیسی ناچیز پر غصہ کر سکتے ہیں میں آپ کے رحم کے لائق ہوں۔ کتنی نحیف، کتنی بے زبان، کتنی حقیر،

آپ آفتاب ہیں - میں ذرہ ہوں - آپ شعلہ ہیں میں خس ہوں - آپ راجہ ہیں میں بھکارن ہوں - غصہ تو برابر والوں پر آتا ہے - میں آپ کے غصہ کی مستحق نہیں ہو سکتی - اگر آپ سمجھتے ہیں میری آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے تو مجھے اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ دے دیجئے میں اسے آبِ حیات کی طرح سر اور آنکھوں سے لگاؤں گی - اور آنکھیں بند کر کے پی جاؤں گی مجھے یہ تسکین کافی ہے کہ میری موت سے آپ کو بے فکری ہوئی - زندگی جب آپ کی نذر ہو گئی تو اسے ماریں یا زندہ رکھیں - یہ آپ کی خوشی ہے - میں تو اتنا ہی جانتی ہوں کہ میں آپکی ہوں اور ہمیشہ آپ کی ہوں گی - اس جنم میں ہی نہیں آئندہ جنموں میں بھی' بلکہ ابد تک !

آپ کی بدنصیب - کسم "

مجھے یہ خط پڑھ کر کسم پر غصہ آنے لگا - اور اس لونڈے سے نفرت ہو گئی - مانا کہ تم عورت ہو اور حال کے رواج کے مطابق مرد کو تمہارے اوپر ہر طرح کا اختیار ہے لیکن اس حد تک انکسار کیا معنی - عورت کو خود دار ہونا چاہئے - اگر مرد اس سے بے اعتنائی کرتا ہے تو اسے بھی چاہئے کہ اس کی بات نہ پوچھے - عورتوں کو دھرم، فرض اور تیاگ کا سبق پڑھا پڑھا کر ہم نے ان کی خود داری اور خود اعتمادی دونوں ہی کا خاتمہ کر دیا - اگر مرد عورت کا محتاج نہیں تو عورت مرد کی محتاج کیوں ہو ؟ ایشور نے مرد کو ہاتھ دئے ہیں تو کیا عورت کو ان سے محروم رکھا ہے ؟ مرد کے دماغ ہے تو کیا عورت خالی الذہن ہے - اس انکسار نے تو مردوں کا مزاج آسمان پر پہنچا دیا - مرد روٹھ گیا تو گویا قیامت آگئی - میں تو سمجھتا ہوں عورت نہیں وہ مرد ہی رحم کے قابل ہے جو کسم جیسی وفا کی دیوی کی قدر نہیں کر سکتا - مجھے ایسا شک ہونے لگا کہ اس

لونڈے نے کوئی دوسرا ہی مرض پال رکھا ہے۔ کسی صیاد کے رنگین جال میں گرفتار ہوگیا ہوگا۔ خیر میں نے تیسرا خط کھولا اور پڑھنے لگا۔

تیسرا خط

میرے دل و جان کے مالک! اب مجھے معلوم ہوگیا کہ میرا زندہ رہنا بے سود ہے جس پھول کو دیکھنے والا، چننے والا کوئی نہیں وہ کھل کر کیا کرے۔ میں آپ کے گھر ایک مہینہ رہ کر دوبارہ آئی ہوں۔ سسر جی نے مجھے بلایا۔ انہوں نے ہی مجھے رخصت کر دیا۔ اس دوران میں آپ نے ایک بار بھی مجھے درشن نہ دیے۔ آپ دن میں بیسیوں ہی مرتبہ گھر میں آتے تھے۔ اپنے بہن بھائیوں سے ہنستے بولتے تھے۔ یار دوستوں کے ساتھ سیر کرتے تھے۔ لیکن میرے پاس آنے کی آپ نے قسم کھالی تھی۔ میں نے آپ کو کتنی بار آپ کے پاس کتنے رقعے بھیجے۔ کتنی منتیں کیں۔ کتنی بار بے شرمی کر کے آپ کے کمرے میں گئی۔ لیکن آپ نے کبھی مجھے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میں تو قیاس بھی نہیں کر سکتی کہ کوئی انسان اتنا سنگدل ہو سکتا ہے۔ میں محبت کے قابل نہیں۔ اعتبار کے قابل نہیں، خدمت کے قابل نہیں، کیا رحم کے قابل بھی نہیں۔ میں نے اس دن کتنی محنت سے آپ کے لئے دس گلے بنائے تھے۔ آپ نے انہیں چھوا بھی نہیں۔ جب آپ مجھ سے اس قدر برداشتہ خاطر ہیں تو میں نہیں سمجھتی کہ زندہ رہ کر کیا کروں۔ نہ جانے وہ کون سی امید ہے جو مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ کیا ستم ہے کہ آپ سزا دیتے ہیں مگر جرم نہیں بتلاتے۔ یہ کون آئین انصاف ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ اس ماہ کے قیام میں میں نے مشکل سے دس دن کھانا کھایا ہوگا۔ میں اتنی کمزور ہوگئی ہوں کہ

جلتی ہوں تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ آنکھوں میں گویا بینائی نہیں رہی۔ دل میں گویا خون کی گردش ہی نہیں رہی۔ خیر ستا لیجئے۔ جتنا جی چاہے رُلا لیجئے۔ اس ستم کی بھی ایک دن انتہا ہو جائے گی۔ اب تو موت ہی پر ساری اُمیدیں قائم ہیں۔ میں جانتی ہوں میری موت کی خبر پا کر آپ مسکرائیں گے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہ گرے گی۔ مگر آپ کی کوئی خطا نہیں۔ یہ میری بدنصیبی ہے۔ میرے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس جنم میں کوئی بہت بڑا گناہ کیا تھا۔ میں چاہتی ہوں میں بھی آپ کی پرواہ نہ کروں۔ آپ ہی کی طرح آپ سے بے التفاتی کروں لیکن نہ جانے کیوں میں اپنے میں وہ طاقت نہیں پاتی۔ لتا درخت کی طرح کھڑی رہ سکتی ہے۔ درخت کے لئے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ قوت کہاں سے لائے۔ وہ تو درخت کے لپٹنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اسے درخت سے الگ کر دو تو وہ خشک ہو جائے گی۔ میں آپ سے علیحدہ اپنی ہستی کا خیال ہی نہیں کر سکتی۔ میری زندگی کے ہر فعل، ہر خیال، ہر آرزو میں آپ موجود ہوتے ہیں۔ میری زندگی ایک دائرہ ہے جس کے مرکز آپ ہیں۔ میں وہ ہار ہوں جس کے ہر پھول میں آپ ہی دھاگے کی طرح پیوست ہو گئے ہیں۔ اس دھاگے کے بغیر ہار کے پھول بکھر جائیں گے۔ اور خاک میں مل مل جائیں گے۔

میری ایک سہیلی کی امسال ہی شادی ہوئی ہے۔ اس کا شوہر جس وقت سسرال آتا ہے شنو کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے، دن میں کتنے روپ بدلتی ہے کہہ نہیں سکتی۔ چہرہ کھل جاتا ہے۔ مسرت سنبھالے میں نہیں آتی۔ اسے بکھیرتی لٹاتی چلتی ہے۔ ہم جیسے بدنصیبوں کے لئے۔ آ کر گلے سے لپٹ جاتی ہے اور اس کے منہ سے خوشیوں کی بارش ہونے لگتی ہے دونوں ایک دوسرے کے اخلاص اور وفا میں متوالے ہو رہے ہیں۔ ان کے پاس دولت نہیں ہے

جائیداد نہیں ہے۔ مگر اپنی بے سروسامانی میں خوش ہیں۔ اس لازوال محبت کا ایک لمحہ ساری دنیا کی دولت سے بیش قیمت ہے۔ میں جانتی ہوں یہ بے فکریاں اور رنگ رلیاں بہت دن نہ رہیں گی۔ افکار و حوادثِ روزگار ان کی زندگی کو بھی پامال کر دیں گے۔ لیکن اس دورِ محبت کی یادگاریں ان کے دل کو ہمیشہ تقویت دیتی رہیں گی۔ محبت میں بھیگی ہوئی روکھی روٹیاں اور محبت میں رنگے ہوئے موٹے کپڑے اور محبت کی روشنی سے نورانی چھوٹا سا حجرہ اپنی بے نوائی میں بھی وہ حلاوت اور وہ برکت اور وہ زیبائش رکھتا ہے جو شاید دیوتاؤں کو جنت میں نصیب نہیں۔ جب شنّو کا شوہر اپنے گھر چلا جاتا ہے تو وہ دکھیا کس طرح پھوٹ کر روتی ہے۔ اس کے خطوط آجاتے ہیں تو گویا اسے کہیں کی نعمت مل جاتی ہے۔ اس کے آنسو اضطراب اور اشتیاق کے آنسو ہیں۔ میرے آنسو مایوسی اور غم کے آنسو ہیں۔ اس کی بے تابیاں انتظار اور شوق کی بے تابیاں ہیں۔ میری بیتابیاں پامالی اور کس مپرسی کی بیتابیاں ہیں۔ اس کے شکوہ میں قبضہ اور اپنا پن ہے۔ میرے شکوے میں دل شکستگی اور بے دست و پائی ہے۔ اس شوق اور انتظار اور درد کی کیفیتوں میں ان کی مسرتوں کا راز پوشیدہ ہے۔ میں ان کیفیتوں سے محروم ہوں۔

خط لمبا ہوا ہوا جاتا ہے اور دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا۔ بڑی شدت کی گرمی پڑ رہی ہے۔ دادا مجھے منصوری لے جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میری لاغری اور خستہ حالی سے انہیں شاید شک ہو رہا ہے کہ میں ٹی بی کا شکار ہوں۔ میرے لئے منصوری ہی نہیں، جنت بھی داد ئی غم ہے۔

آپ کی حسرت زدہ ــــ کسم"

چوتھا خط

میرے پیتر کے دیوتا اجکل منصوری سے لوٹ آئی۔ لوگ کہتے ہیں بڑی پُر فضا جگہ ہے، ہو گی۔ میں تو ایک دن بھی کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ افسردہ دلوں کے لئے دُنیا ویران ہے۔ میں نے رات کو ایک پُر نشاط خواب دیکھا۔ بتاؤں؟ مگر کیا فائدہ۔ نہ جانے کیوں میں اب بھی موت سے ڈرتی ہوں۔ امید کا کچا دھاگا مجھے اب بھی زندگی سے باندھے ہوئے ہے۔ باغِ زندگی کے دروازے پر آکر بغیر سیر کئے لوٹ جانا کتنا حسرتناک ہے۔ اندر کیا کیا بہاریں ہیں۔ کیا کیا نغمے ہیں۔ کیا کیا دلفریبیاں ہیں۔ میرے لئے وہ دروازہ بند ہے۔ کتنی آرزوؤں سے سیر کا لُطف اُٹھانے چلی تھی۔ کتنی تیاریوں سے۔ مگر میرے پہنچتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

اچھا بتلاؤ؟ میں مر جاؤں گی تو میری میت پر دو بوندیں آنسو گراؤ گے جس کی زندگی بھر کی ذمہ داری لی تھی۔ جس کی ہمیشہ کے لئے بانہہ پکڑ لی تھی۔ کیا اس کے ساتھ اتنی بھی فیاضی نہ کرو گے۔ مرنے والوں کی خطائیں سب معاف کر دیا کرتے ہیں۔ تم بھی معاف کر دینا۔ آکر میری لاش کو اپنے ہاتھوں سے نہلانا۔ اپنے ہاتھ سے سُہاگ کا سیندور لگانا۔ اپنے ہاتھ سے سہاگ کی چوڑیاں پہنانا، اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں گنگا جل ڈالنا۔ چار قدم کے لئے کندھا دے دینا۔ میری روح خوش ہو جائے گی اور تمہیں دعائیں دے گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایشور کے دربار میں تمہارا جشن گاؤں گی، کیا یہ بھی مہنگا سودا ہے؟ اتنی سی ظاہر داری کر کے تم اپنے سارے فرائض شوہری سے سبکدوش ہوئے جاتے ہو۔ کاش مجھے اس کا یقین ہوتا تو میں کتنی خوشی

سے مرتی کیتنی خوشی سے موت کا خیر مقدم کرتی! لیکن میں تمہارے ساتھ
اتنی بے انصافی نہ کروں گی۔ تم ہزار سنگدل ہو۔ اتنے بے رحم نہیں ہو سکتے
میں جانتی ہوں تم خبر پاکر آؤ گے اور شاید ایک لمحہ کے لئے میری مرگ حسرت
پر تمہاری آنکھیں رو پڑیں۔ آہ کاش میں اپنی زندگی میں وہ نظارہ دیکھ سکتی
اچھا، کیا میں ایک سوال پوچھ سکتی ہوں۔ ناراض نہ ہونا۔ کیا میری
جگہ کسی اور نے لے لی ہے؟ اگر ایسا ہے تو مبارک! ذرا اس کی تصویر میرے
پاس بھیج دینا۔ میں اس کی پوجا کروں گی۔ اس کے قدموں کو بوسہ دوں گی؟ میں
جس پتھر کے دیوتا کو نہ پگھلا سکی اس سے اس نے بردان پایا۔ ایسی خوش نصیب
عورت کے قدم دھو دھو کر پیوں گی۔ میری دلی دعا ہے کہ تم اس کے ساتھ آرام
سے زندگی بسر کرو۔ کاش میں اس کی خدمت کر سکتی۔ بے واسطہ نہیں، بالواسطہ
تمہارے ساتھ اپنا کچھ فرض ادا کر دیتی۔ تم مجھے صرف اس کا نام اور پتہ بتا دو میں
میں سر کے بل دوڑی ہوئی اس کے پاس جاؤں گی اور کہوں گی۔ دیوی میں تمہاری
کنیز ہوں، اس لئے کہ تم میرے مالک کی منظور نظر ہو۔ مجھے اپنے قدموں میں جگہ دو
میں تمہارے لئے پھولوں کی سیج بچھاؤں گی۔ تمہارے گیسوؤں کو موتیوں سے
گوندھوں گی۔ تمہارے ماتھے پر سہاگ کا ٹیکہ لگاؤں گی۔ تمہاری ایڑیوں میں مہندی
رچوں گی۔ یہی میرا مقصد حیات ہو گا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں جلوں گی یا کڑھوں گی۔ جلن
اس وقت ہوتی ہے جب کوئی مجھ سے میری چیز چھین رہا ہو۔ جس چیز کو اپنا سمجھنے
کا کبھی مجھے موقعہ ہی نہ ملا اس کے لئے مجھے کیوں جلن ہو؟ ابھی بہت کچھ لکھنا تھا
لیکن ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔ غریب مرض کو ٹی بی سمجھ رہا ہے۔

آپ کی حسرت نصیب۔۔۔ کسم"

ان دونوں خطوں نے ذرا دیر کے لئے مجھ پر جنون کا عالم طاری کر دیا۔ میں

بھی سلامت پسند آدمی ہوں۔ میرے جذبات جلد ہیجان میں نہیں آتے۔ اکثر ادیبوں کی طرح میں بھی الفاظ سے متاثر نہیں ہوتا۔ کیا چیز دل سے نکلی ہے۔ کیا چیز محض تاثیر کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس کا لطف اکثر افسانوں میں خارج ہو جاتا ہے۔ لیکن ان خطوط نے مجھے ازخود رفتہ بنا دیا۔ ایک جگہ تو واقعی میری آنکھیں آب گوں ہوگئیں یہ خیال کتنا روح فرسا تھا کہ ناز و نعم میں پلی ہوئی کسُم جسے ماں باپ دونوں اپنی آنکھوں سے زیادہ پیار کرتے تھے شادی ہوتے ہی یکایک اتنی بے کس و مجبور ہو۔ شادی کیا ہوئی اس کی چتا تیار ہوئی یا اس کے قتل کا پروانہ لکھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے دردناک سانحے زیادہ نہیں ہوتے لیکن ان کا امکان تو ہے۔ جب تک ہر دو فریق کے حقوق و اختیار دو فرائض مساوی نہ ہوں ایسے سانحے ہمیشہ ہوتے رہیں گے زیر دست کو ستانا شاید انسانی خاصہ ہے۔ کاٹنے والے کتّے سے لوگ دور بھاگتے ہیں۔ سیدھے کتّے پر لونڈے تفریح کے لئے پتھر پھینکتے ہیں۔ لیکن آج ان میں سے ایک کو افسر اور دوسرے کو اس کا ماتحت بنا دو۔ پھر دیکھو افسر صاحب اپنے ماتحت پر کتنا رُعب جماتے ہیں۔ موجودہ حالات میں بیوی بننا غلامی ہی نہیں مرد سے کمتر درجہ قبول کرنا ہے۔ محبت تو مساوات تامّہ کا نام ہے۔ اس نا ہمواری میں محبت کا وجود ہو سکتا ہے مجھے تو اس میں بھی شک ہے۔ ہم آج جسے محبت کہتے ہیں۔ وہ فی الواقع وہی محبت ہے جو جانور کو اپنے آقا سے ہو سکتی ہے جانور سر جھکائے کام کئے چلا جائے۔ مالک اسے بھوسا اور کھلی بھی دے گا۔ اس کا بدن بھی سہلائے گا۔ اس کو زیورات سے آراستہ بھی کرے گا۔ لیکن جانور نے ذرا رفتار سست کی، ذرا گردن ٹیڑھی کی اور مالک کی قمچی پیٹھ پر پڑی۔ یہ محبت نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔

نیر میں نے پانچواں خط کھولا۔

پانچواں خط

"نیا مجھے یقین تھا آپ نے میرے خط کا بھی جواب نہ دیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے مجھے ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔ مردوں کے لئے بیر تو پیر کی جوتی ہو، عورت کے لئے مرد دیوتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ طلوع شعور کے ساتھ ہی وہ شوہر کے نام پر بک جاتی ہے جس وقت میں گڑیاں کھیلتی تھی، اسی وقت آپ نے گڈے کے روپ میں میرے خانۂ دل میں قدم رکھا میں نے آپ کے قدموں کو چوما۔ اور پھول اور بتاشے سے آپ کی تواضع کی۔ پھر آپ کہانیوں کے رہبر کے روپ میں میرے گھر آئے۔ میں نے آپ کو دل میں جگہ دی۔ آپ کے خوں ریز معرکوں میں، آپ کے ہیبت ناک نوردیوں میں آپ کے ساتھ رہی۔ ایام طفلی سے اب تک آپ کسی نہ کسی صورت میں میرے دل میں موجود تھے۔ وہ جذبات میرے قلب کی گہرائیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ میرے وجود کا ایک ایک ذرہ ان کی پرورش کرتا رہا ہے۔ انہیں دل سے نکال ڈالنا آسان نہیں ہے۔ اس کے ساتھ میری ہستی کے ریزے بھی منتشر ہو جائیں گے۔ لیکن آپ کی مرضی ہے تو یہی سہی۔ میں آپ کی خدمت میں سب کچھ کرنے کو آمادہ تھی۔ عشرت اور تمنا کا تو ذکر ہی کیا میں اپنے کو فنا کر دینے کو آمادہ تھی۔ آپ کی خدمت میں فنا ہو جانا ہی میری زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد تھا۔ میں نے شرم و حیا کو خیرباد کہا۔ خودداری کو پیروں سے کچلا۔ لیکن آپ کو منظور نہیں ہے۔ مجبور ہوں۔ آپ کا کوئی قصور نہیں۔ ضرور مجھ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوا ہے جسے آپ زبان پر نہیں لانا

چاہئے۔ میں اس بے اعتنائی کے سوا اور ہر ایک سزا جھیلنے کو تیار تھی۔ آپ کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ لے کر پی جانے میں بھی مجھے تامل نہ ہوتا۔ مگر نوشتۂ تقدیر سے کیا چارہ۔ آپ میرے خطوط واپس کر دیں۔ یہی میری آخری التجا ہے۔ یہ زیور اور بیش قیمت جوڑے میرے کس کام کے۔ انہیں اپنے پاس رکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ آپ انہیں جس وقت چاہیں واپس منگوالیں۔ میں نے انہیں ایک صندوق میں بند کر کے الگ رکھ دیا ہے۔ ان کی فہرست بھی صندوق میں ہے۔ ملا لیجئے گا۔ آج سے آپ میری زبان اور قلم سے کوئی شکایت نہیں پائیں گے۔ اس خیال کو بھول کر بھی دل میں جگہ نہ دیجئے گا کہ میں آپ سے بیوفائی کروں گی۔ میں اسی گھر میں کڑھ کڑھ کر مر جاؤں گی۔ مگر آپ کی جانب سے خیال فاسد میرے دل میں نہ آنے گا۔ میں آپ کے ناموس کی امین ہوں۔ اس امانت میں تا دم زیست خیانت نہ ہوگی۔ اگر میرے مکان میں ہوتا تو میں اسے واپس کر دیتی لیکن میں بھی مجبور ہوں، اور آپ بھی مجبور ہیں۔ میری ایشور سے یہی دعا ہے کہ آپ جہاں رہیں خوش رہیں۔ زندگی میں مجھے سب سے جگر سوز یہی تجربہ ہوا کہ عورت کی زندگی لعنت ہے اپنے لئے، اپنے والدین کے لئے، اپنے خاندان کے لئے۔ اس کی قدر نہ والدین کے گھر میں ہے، نہ شوہر کے گھر میں۔ میرا گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ اماں رو رہی ہیں، دادا رو رہے ہیں۔ عزیز بیگانے سب رو رہے ہیں۔ ساری دنیا ایک طرف ہو جائے۔ آپ سے عہد بر آ نہیں ہو سکتی۔ یہ آپ کا فیصلہ ناطق ہے۔ اس کی کہیں اپیل نہیں۔ کہیں فریاد نہیں۔ خیر! قسمت سے یہ قصۂ زندگی تمام ہوا۔ اب میں ہوں اور میرا پایمال دل۔ حسرت یہ ہے کہ آپ کی کچھ خدمت نہ کر سکی۔

"بد نصیب کشمی"

۳

معلوم نہیں میں کتنی دیر تک عالم سکوت میں بیٹھا رہا۔ کہ حضرت شاطر نے فرمایا: "آپ نے ان خطوط کو پڑھ کر کیا رائے قائم کی؟"

میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا: "اگر ان خطوط نے اس ظالم کے دل پر اثر نہیں کیا تو میرا خط بھلا اس پر کیا اثر کرے گا۔ ان سے زیادہ درد ناک اور پُر تاثیر تحریر میرے امکان سے باہر ہے۔ ایسا کون سا انسانی جذبہ ہے جسے ان خطوط میں متحرک نہ کیا گیا ہو۔ غیرت، رحم، درد، میرے خیال میں تو اس نے کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔ میرے لئے تو آخری تدبیر یہی ہے کہ اس شیطان کے سر پر سوار ہو جاؤں اور اس سے دوبدو گفتگو کر کے معاملہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ اگر اس نے مجھے کوئی قابلِ اطمینان جواب نہ دیا تو میں اپنا اور اس کا خون ایک کر دوں گا۔ یا تو مجھے پھانسی ہو گی یا وہی کالے پانی جائے گا۔ کہ تم نے جتنا تحمل کیا ہے اس پر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں اطمینان سے گھر واپس جائیں۔ میں آج رات کی گاڑی سے جاؤں گا اور پرسوں تک جو صورت حال ہو گی اس کی آپ کو اطلاع دوں گا۔ مجھے یہ کوئی انتہا درجہ کا خبیث النفس آدمی معلوم ہوتا ہے۔ صورت اور سیرت میں اتنا تفاوت میں نے پہلی بار دیکھا۔ ظالم سمجھتا ہو گا کہ تم اس کے قابل نہیں۔ کیونکہ وہ نمائش اور تصنع نہیں جانتی۔ میں ایسے ایسے ایک ہزار لونڈوں کو سر نثار کر دوں۔"

میں بہک گیا اور نہ جانے کیا کیا بکتا رہا۔ اس کے بعد ہم دونوں کھانا کھا کر اسٹیشن چلے۔ وہ آگرہ گئے میں نے مراد آباد کا راستہ لیا۔ شاطر صاحب کی

روح اسوقت بھی فنا ہو رہی تھی کہ میں غصہ میں کوئی بے عنوانی نہ کر بیٹھوں۔ بارے میرے بہت اطمینان دلانے پر انہیں تشفی ہوئی۔

میں علی الصباح مراد آباد پہنچا اور تفتیش شروع کردی۔ ان حضرت کے اطوار کے متعلق مجھے جو شبہہ تھا وہ غلط نکلا۔ محلّہ میں، کالج میں، اس کے دوستوں میں سبھی اس کے مدّاح تھے۔ معاملہ زیادہ پیچیدہ ہوتا ہوا معلوم ہوا آخر شام کو میں اس کے گھر چلا پہنچا اور اس کے والد سے ملنا نہ سو دیکھ کر براہ راست اس سے ملا جس سعادتمندی سے وہ مجھ سے ملا میں اُسے بھول نہیں سکتا نہایت شائستہ انداز کلام تھا۔ مزاج میں حد درجہ انکسار۔ میں نے دو چار تمہیدی جملوں کے بعد کہا "تم سے مل کر مجھے کمال مسرت ہوئی لیکن آخر کلثوم نے کیا خطا کی ہے جس کی تم اسے ایسی سخت سزا دے رہے ہو۔ اس غریب نے تمہارے پاس کئی خط لکھے۔ تم نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ وہ دو تین بار یہاں بھی آئی۔ مگر تم اس سے مخاطب نہ ہوئے۔ کیا یہ اس معصوم کے ساتھ تمہاری بے انصافی نہیں ہے؟"

نوجوان نے ندامت آمیز انداز سے کہا "بہتر ہوتا کہ آپ نے اس مسئلہ کو نہ چھیڑا ہوتا۔ اس کا جواب دینا میرے لئے بہت مشکل ہے میں نے تو اسے آپ صاحبوں کے تیا فہ پر چھوڑ دیا تھا اور سمجھتا تھا کہ مجھے اظہار حال کی ضرورت نہ پڑے گی لیکن غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس لئے اب مجھے مجبوراً عرض کرنا پڑیگا۔ ممکن ہے آپ مجھے انتہا درجہ خودپرور، کمینہ اور حریص سمجھیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ میری شادی نے وہ تمنا پوری نہ کی جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھی۔ میں شادی کرنے پر رضامند نہ تھا۔ اپنے پیروں میں زنجیر ڈالنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن جب جناب شاطر صاحب بہت درپے ہوئے اندراز

کی باتوں سے مجھے یہ گمان کرنے کا موقعہ ملا کہ وہ میری ہر ممکن صورت سے امداد کرنے کو آمادہ ہیں تو میں رضا مند ہو گیا۔ مگر انہوں نے میری مطلق امداد نہ کی۔ ان کی بے اعتنائی نے میری زندگی کے سارے خواب پریشان کر دئے۔ میرے لئے اب بجز اس کے اور کیا ہے کہ ایل، ایل، بی پاس کر لوں اور عدالت میں جوتیاں چٹخاتا پھروں۔"

میں نے پوچھا " تو تم حضرت شاطر سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو۔ داد و دہش میں تو انہوں نے شکایت کا موقعہ نہ دیا۔"

نوجوان نے سر جھکا کر کہا " اس داد و دہش سے میرا ذاتی فائدہ کیا ہوا طرفین کے دس بارہ ہزار روپے خاک میں مل گئے۔ اور انہیں کے ساتھ میری آرزوئیں بھی خاک میں مل گئیں۔ والد صاحب تو مقروض ہو گئے ہیں اور اب میری تعلیم کے بار کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ میں بیکار کے طور پر ایل، ایل، بی کلاس میں شریک ہو گیا ہوں۔ کیا خسر صاحب مجھے انگلینڈ نہ بھیج سکتے تھے۔ ان کے لئے دس پانچ ہزار روپے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔"

میں سکتے میں آ گیا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا " لاحول ولا قوۃ"

ان صاحبزادے کا جتنا وقار میری نظروں میں قائم ہو گیا تھا وہ جھوٹے رنگ کی طرح اڑ گیا۔ واہ ری دنیا! واہ رے ہندو سماج! تیرے یہاں ایسے دنیا پرست پڑے ہوئے ہیں جو ایسے ظالمانہ وحشیانہ دباؤ ڈال کر، ایک معصوم زندگی کو تباہ کر کے منصب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تحصیل علم کے لئے انگلستان یا امریکہ جانا برا نہیں۔ خدا توفیق دے تو شوق سے جاؤ۔ مگر بیوی کو ترک کر کے خسر پر اس کا بار ڈالنا بے غیرتی کی انتہا ہے۔ تعریف کی بات تو یہ تھی کہ تم اپنی قوت بازو سے جاتے۔ حالانکہ خود غرضانہ محبت بہت ہی معیوب ہے

اور کوئی غیرت مند آدمی محبت میں غرض کو شامل نہ کرے گا۔ لیکن اس وحشیانہ طرزِ عمل کے مقابلہ میں پھر بھی غنیمت ہے۔ کُسُم کو ایک فرضی فردگذاشت کے لئے قابلِ گردن زدنی ٹھہرا دینا چھچھورے پن کی انتہا ہے۔ اس ظالم کی نگاہ میں کُسُم کی کوئی حقیقت نہیں۔ کُسُم محض آلہ ہے اس کی دنیا طلبی کا۔ ایسے پست خیال آدمی سے کچھ بحث کرنا بیکار ہے۔ میں نے سوچا اس وقت "دہنِ سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" والی پالیسی ہی موزوں ہے۔

دوسری گاڑی سے میں آگرہ جا پہنچا اور مسٹر شاطر سے یہ سرگذشت کہی۔ اُن غریب کو کیا معلوم تھا کہ یہاں ساری ذمہ داری انہیں کے سر ڈال دی گئی ہے۔ اگرچہ اس عام سرد بازاری نے ان کی وکالت بھی ٹھنڈی کر رکھی ہے اور وہ دس ہزار کا خرچ بے تکلف برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر اس صاحبزادے نے کنایتہً بھی اُن سے کہا ہوتا تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی انتظام کرتے۔ کُسُم کے سوا دوسرا اُن کا کون بیٹھا ہوا ہے۔ ان غریب کو تو حقیقت کا علم ہی نہ تھا۔ چنانچہ میں نے جوں ہی یہ قصہ کہا۔ وہ بولے "جی! اس ذرا سے معاملہ کو اس شخص نے خواہ مخواہ طول دے دیا۔ آج ہی آپ اسے لکھ دیں کہ وہ جس وقت، جہاں تحصیلِ علم کے لئے جانا چاہے شوق سے جا سکتا ہے میں اس کی ساری ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ سال بھر تک ظالم نے کُسُم کو رُلا رُلا کر مار ڈالا۔ غرض حال کا اس کے سوا اُسے کوئی طریقہ ہی نہ سوجھا"

گھر میں اس کا چرچا ہوا۔ کُسُم نے بھی ماں سے سُنا۔ معلوم ہوا کہ ایک ہزار کا چیک اس کے شوہر کے نام بھیجا جا رہا ہے۔ مگر اس طرح جیسے کوئی آئی بلا کو ٹالنے کے لئے نیا زینہ ڈھائی جا رہی ہو۔

کلثوم نے نجویں سکیڑ کر ماں سے کہا "روپیہ بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اماں، دادا سے کہہ دو۔" ماں نے حیرت سے لڑکی کی جانب دیکھا "کیسے روپے؟ اچھا وہ کیوں؟ کیا ہرج ہے۔ لڑکے کا دل ہے تو جائے اور یوں بھی اسی کا ہے۔ ہمیں کون چھاتی پر لاد کر لے جانا ہے۔"

"نہیں۔ آپ دادا سے کہہ دیجئے ایک پائی بھی نہ بھیجیں۔"

"آخر اس میں برائی کیا ہے؟"

"اس لئے کہ یہ اس طرح کی ڈاکہ زنی ہے جیسے بدمعاش کیا کرتے ہیں۔ کسی آدمی کو پکڑ کر لے گئے اور اس کے گھر والوں سے اس کی آزادی کے لئے ایک اچھی رقم وصول کر لی۔"

ماں نے تنبیہ کی آنکھوں سے دیکھا "کیسی باتیں کرتی ہو بیٹی۔ سات دنوں کے بعد تو جا کے دیوتا سیدھے ہوئے ہیں اور تم انہیں پھر چڑھائے دیتی ہو۔"

کلثوم نے جھلا کر کہا "ایسے دیوتا کا روٹھے رہنا ہی اچھا۔ جو شخص اتنا دنیا پرست، خود غرض اور حریص ہے اس کے ساتھ میرا نباہ نہ ہو گا۔ میں کہے دیتی ہوں اگر وہاں روپے گئے تو میں زہر کھا لوں گی۔ اسے مذاق نہ سمجھنا۔ میں ایسے آدمی کا منہ بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم دادا سے کہہ دینا۔ اور اگر تمہیں ڈر لگتا ہو تو میں خود کہہ دوں گی۔ میں نے تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

ماں نے دیکھا لڑکی کا چہرہ تمتما اٹھا ہے۔ گویا اس مسئلہ پر وہ اب نہ کچھ کہنا چاہتی ہے نہ سننا۔

دوسرے دن شاطر صاحب نے یہ قصہ مجھ سے کہا تو میں ایک بے خودی کے عالم میں دوڑتا ہوا کلثوم کے پاس گیا اور اسے گلے لگا لیا۔

سال بھر ہو گیا ہے۔ کلثوم نے شوہر کے پاس نہ ایک خط بھی لکھا اور نہ اس کا

ذکر ہی کرتی ہے۔ شاطر صاحب نے کئی بار داماد کو منانے کا ارادہ ظاہر کیا مگر کلثوم اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتی۔ اس میں خود اعتمادی کی ایسی سپرٹ پیدا ہو گئی ہے۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور حسرت زردی اور بے رونقی کی جگہ خودداری اور آزادی کی سرخی نمودار ہو گئی ہے۔

اکسیر

بیوہ ہو جانے کے بعد بوٹی کے مزاج میں کچھ تلخی آگئی تھی۔ جب خانہ داری کی پریشانیوں سے بہت جی جلتا تو اپنے جنت نصیب کو صلواتیں سناتی "آپ تو سدھار گئے۔ میرے لیے یہ سارا جنجال چھوڑ گئے جب اتنی جلدی جانا تھا تو شادی نہ جانے کس لئے کی تھی۔ گھر میں بھونی بھانگ نہ تھی چلے تھے شادی کرنے" بوٹی چاہتی تو دوسری سگائی کر لیتی۔ اہیروں میں اس کا رواج ہے۔ اس وقت وہ دیکھنے سننے میں بھی بری نہ تھی۔ دو ایک اس کے خواستگار بھی تھے لیکن بوٹی عفت پروری کے خیال کو نہ روک سکی۔ اور یہ سارا غصہ اترتا تھا اس کے بڑے لڑکے موہن پر، جس کا سولہواں سال تھا۔ سوہن ابھی چھوٹا تھا اور مینا لڑکی تھی۔ یہ دونوں ابھی

کس لائق تھے۔ اگر یہ تین بچے اس کی چھاتی پر سوار نہ ہوتے تو کیوں اتنی تکلیف ہوتی۔ جس کے گھر میں تھوڑا سا کام کر دیتی؛ وہ روٹی کپڑا دے دیتا۔ جب چاہتی کسی کے گھر بیٹھ جاتی۔ اب اگر وہ کہیں بیٹھ جائے تو لوگ یہی کہیں گے کہ تین تین بچوں کے ہوتے یہ اسے کیا سوجھی! موہن اپنی بساط کے مطابق اس کا بار ہلکا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جانوروں کو سانی پانی ڈھونا متھنا یہ سب وہ کر لیتا لیکن بوٹی کا منہ سیدھا نہ ہوتا تھا۔ روزانہ ایک نہ ایک بات نکالتی رہتی تھی۔ اور موہن نے بھی عاجز ہو کر اس کی تلخ نوائیوں کی پرواہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بوٹی کو شوہر سے یہی گلہ تھا کہ وہ اس کے گلے پر گرہستی کا جنجال چھوڑ کر چلا گیا۔ اس غریب کی زندگی ہی تباہ کر دی۔ نہ کھانے کا سکھ میسر ہوا نہ پہننے کا، نہ اور کسی بات کا۔ وہ اس گھر میں کیا آئی گویا بھٹی میں پڑ گئی۔ اس کے ارمانوں کی تشنہ کامی اور بیوگی کے قیود میں ہمیشہ ایک جنگ سی چھڑی رہتی تھی اور جلن میں ساری مٹھاس جل کر خاک ہو گئی تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد بوٹی کے پاس اور کچھ نہیں تو چار پانچ سو کے زیور تھے لیکن ایک ایک کر کے وہ سب اس کے ہاتھ سے نکل گیا! اسکے برادری میں کتنی ہی عورتیں ہیں جو عمر میں اس سے بڑی ہونے کے باوجود گہنے چھمکا کر، آنکھوں میں کاجل لگا کر، مانگ میں سیندور کی موٹی سی لکیر ڈال کر گویا اسے جلاتی رہتی ہیں۔ اس لئے جب ان میں سے کوئی بیوہ ہو جاتی ہے تو بوٹی کو ایک حاسدانہ مسرت ہوتی ہے۔ وہ شاید ساری دنیا کی عورتوں کو اپنی ہی جیسی دیکھنا چاہتی تھی اور اسکی محروم آرزوں کو اپنی پاکدامنی کی تعریف اور دوسروں کی پردہ دری اور حرف گیری کے سوا سکون قلب کا اور کیا ذریعہ تھا۔ کیسے اپنے آنسو پونچھتی! وہ چاہتی تھی اس کا خاندان نیک سیرت کا نمونہ ہو۔ اس کے لڑکے ترغیبات سے بے اثر رہیں۔ یہ نیک نامی بھی اس کی پاکدامنی کے غرور کو مشتعل کرتی رہتی تھی۔

اس لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ موہن کے متعلق کوئی شکایت سُنے اور ضبط کر جائے۔ تردید کی گنجائش نہ تھی۔ غیبت کی اس دنیا میں رہتے رہتے وہ ایک خاص قسم کی باتوں میں بے انتہا سہل اعتقاد ہو گئی تھی۔ گویا وہ کوئی ایسا سہارا ڈھونڈتی رہتی تھی جس پر چڑھ کر وہ اپنے کو دوسروں سے اونچی دکھا سکے۔ آج اس کے غرور کو ٹھیس لگی۔ موہن جوں ہی دودھ بیچ کر گھر آیا بوٹی نے اسے قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا "دیکھتی ہوں، اب تجھے ہوا لگ رہی ہے۔"

موہن اشارہ نہ سمجھ سکا۔ پُرسوال نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں، کیا بات ہے؟"

"تڑمانے گا تو نہیں۔ اُلٹا مجھی سے پوچھتا ہے۔ تو رولیا سے چھپ چھپ کر نہیں ہنستا بولتا۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ گھر میں پیسے پیسے کی تنگی ہے اور اس کے لئے پان لائے جاتے ہیں۔ کپڑے رنگائے جاتے ہیں۔"

موہن نے عذرِ گناہ کیا جو گناہ سے بھی بد تر تھا۔

"تو میں نے کون سا گناہ کر ڈالا۔ اگر اس نے مجھ سے چار پیسے کے پان مانگے تو کیا کرتا۔ کہتا کہ پیسے دے تو پان لاؤں گا۔ اپنی ساڑھی رنگانے کو دیدی تو اس سے رنگائی مانگتا۔"

"محلے میں ایک تو ہی بڑا دھنا سیٹھ ہے۔ اس نے اور کسی سے کیوں نہ کہا؟"

"یہ وہ جانے۔ میں کیا بتاؤں۔"

"کبھی گھر میں بھی دھیلے کے پان لایا، یا ساری خاطر داری دوسروں کے لئے ہی رکھ چھوڑی ہے؟"

"یہاں کس کے لئے پان لاتا؟"

"تیرے لئے کیا گھر کے سارے آدمی مر گئے؟"

"میں نہ جانتا تھا تم بھی پان کھانا چاہتی ہو۔"

"سنسار میں ایک رو پا ہی پان کھانے کے لائق ہے ؟"

"شوق سنگار کی بھی تو ایک عمر ہوتی ہے۔"

بوٹی جل اٹھی۔ اُسے بڑھیا کہہ دینا اس کے تقویٰ و طہارت کو خاک میں ملا دینا تھا۔ بڑھاپے میں ان پابندیوں کی وقعت ہی کیا۔ جب نفس کشی کے بل پر وہ سب عورتوں کے سامنے سر اٹھا کر چلتی تھی۔ اس کی یہ ناقدری! انہی لڑکوں کے پیچھے اس نے اپنی ساری جوانی خاک میں ملا دی۔ اس کے شوہر کو گذرے آج پانچ سال ہوئے، تب اس کی چڑھتی جوانی تھی۔ یہ تین بچے پوت اس کے گلے منڈھ دئے ہیں ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ چاہتی تو آج وہ بھی ہونٹ سُرخ کئے پاؤں میں مہندی رچائے، الوٹ، بچھوے پہنے مٹکتی پھرتی۔ یہ سب کچھ اس نے لڑکوں کے کارن تیاگ دیا اور بوٹی بڑھیا ہے۔

بولی "ہاں اور کیا، میرے لئے تو اب پھٹے چیتھڑے پہننے کے دن ہیں جب تیرا باپ مرا تو میں رو پا سے دو ہی چار سال بڑی تھی۔ اس وقت کوئی گھر کر لیتی تو تم لوگوں کا کہیں پتہ نہ لگتا۔ گلی گلی بھیک مانگتے پھرتے۔ لیکن میں کہے دیتی ہوں اگر تو پھر اس سے بولا تو یا تو تو ہی گھر میں رہے گا یا میں ہی رہوں گی۔"

موہن نے ڈرتے ڈرتے کہا "میں اسے بات دے چکا ہوں، اماں۔"

"کیسی بات ؟"

"سگائی کی۔"

"اگر رو پا میرے گھر میں آئی تو جھاڑو مار کر نکال دوں گی۔ یہ سب اس کی ماں کی مایا ہے وہی کٹنی میرے لڑکے کو مجھ سے چھینے لیتی ہے۔ رانڈ سے اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا۔ چاہتی ہے کہ اسے سوت بنا کر میری چھاتی پر مونگ دلے۔"

موہن نے دردناک لہجہ میں کہا "اماں ایشور کے لئے چپ رہو۔ کیوں اپنا پانی آپ کھو رہی ہو۔ میں نے تو سمجھا تھا چار دن میں مینا اپنے گھر چلی جائے گی۔ تم اکیلی نہ جاؤ گی۔ اسی لئے اسے لانے کا خیال ہوا۔ اگر تمہیں بُرا لگتا ہے تو جانے دو۔"

بڑھیا نے شبہہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا "تو آج سے یہیں آنگن میں سویا کرو گے۔ بچھیں باہر پڑی رہیں گی؟"

"پڑی رہنے دو۔ کوئی ڈاکہ نہیں پڑا جاتا۔"

"مجھ پر تجھے اتنا شبہہ ہے؟"

"ہاں۔"

موہن نے خودداری کی شان سے کہا "میں یہاں نہ سوؤں گا۔"

"تو نکل جا میرے گھر سے۔"

"ہاں تیری یہی مرضی ہے تو نکل جاؤں گا۔"

مینا نے کھانا پکایا۔ موہن نے کہا "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

بڑھیا اسے منانے نہ گئی۔ موہن کا سرکش دل ماں کے اس جابرانہ حکم کو کسی طرح قبول نہیں کر سکتا۔ ماں کا گھر ہے۔ لے لے۔ اپنے لئے وہ کوئی دوسرا ڈھونڈ لے گا۔ روپا نے اس کی بے لطف بے کیف زندگی میں ایک مسرت پیدا کر دی تھی۔ جب وہ اپنے دل میں ایک ناقابلِ بیان سوزش کا احساس کرتا تھا۔ جب وہ اپنی زندگی کی معمولی پُرمشقت رفتار سے بیزار ہو رہا تھا جب دنیا اسے سوکھی سونی بچھیوں سے خالی نظر آ رہی تھی۔ اس وقت روپا نے اس کی زندگی میں بہار کی طرح رونما ہو کر اسے سرخ کونپلوں اور طیور کے نغموں سے حلاوت پیدا کر دی۔ اب اس کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی کام کرتا ہوتا تو دل روپا کی طرف لگا ہوتا۔ یہی ارمان تھا کہ اسے کیا چیز دے دے کہ وہ خوش ہو جائے۔

بڑی ہمت کرکے اس نے اس سے اپنا دردِ دل کہا۔ اب آج وہ کس منہ سے اس کے پاس جائے۔ کیا اس سے کہے کہ اماں نے مجھے تم سے ملنے کی ممانعت کی ہے۔ ابھی کل تو چراگاہ میں برگد کے سایہ دار درخت کے نیچے دونوں میں کیسے خلاص کی باتیں ہو رہی تھیں۔ موہن نے کہا تھا "روپا تم اتنی سندر ہو کہ تمہارے سو گاہک نکل آئیں گے۔ تم جس گھر میں جاؤگی وہ روشن ہو جائے گا۔ میرے گھر میں تمہارے لئے کیا رکھا ہے" اس پر روپا نے جواب دیا تھا۔ وہ ایک نغمۂ لطیف کی طرح اس کے جسم کی ایک ایک رگ میں، اس کی روح کے ایک ایک، ذرہ میں بسا ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

" میں تو تم کو چاہتی ہوں موہن صرف تم کو پرگنے کے چودھری ہو جاؤ تب بھی موہن ہو، مزدوری کرنے لگو تب بھی موہن ہو" وہ اپنے موہن کے لئے افلاس، رسوائی اور فاقہ کشی سب کچھ جھیل لے گی"۔ اسی روپا سے اب وہ جاکر کہے "مجھے اب تم سے کوئی سروکار نہیں ہے"!

نہیں یہ غیر ممکن ہے۔ اسے گھر کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ روپا کے ساتھ ماں سے الگ رہے گا۔ یہاں نہ سہی، کسی دوسرے محلے میں سہی۔ اس وقت بھی روپا اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ کیسے اچھے بیڑے لگاتی ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔ جیسے بیڑوں میں پریم گھول دیتی ہے۔ لیکن جاؤگے کیسے؟ اماں سے وعدہ نہیں کیا ہے؟ کہیں اماں سن لیں کہ یہ رات کو روپا کے پاس گیا تھا تو جان ہی دیدیں تو میرا کیا نقصان؟ دے دیں جان اپنی، تقدیر کو تو نہیں بکھاتیں کہ ایسی دیوی جو انہیں پان کی طرح پھیرے گی۔ الٹے اور اس سے جلتی ہیں۔ نہ جانے کیوں روپا سے اُسے اتنی چڑھ ہے۔ وہ ذرا پان کھالیتی ہے۔ ذرا رنگین ساڑھی پہن لیتی ہے بس یہی تو اس کی عمر کھانے پہننے کی ہے۔ کیا بُرا کرتی ہے۔

چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ رُوپا آرہی ہے شاید۔ ہاں وہی ہے۔ موہن کے سازِ جسم کے سارے تار جھنکار اُٹھے۔ اس کے وجود کا ایک ایک ذرّہ ناچنے لگا روپا اس کے دروازے پر آئی۔ شیریں ادا روپا۔ کیسے اس کا خیر مقدم کرے، کیا کرے ؟ جاکر اس کے قدموں پر سر رکھ دے۔

روپا اس کے سرہانے آکر بولی "کیا سو گئے موہن ؟ اتنی جلدی، گھڑی بھر سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ آئے کیوں نہیں ؟"

موہن نیند کا بہانہ کئے پڑا رہا۔

روپا نے اس کا سر ہلا کر کہا "کیا سو گئے موہن ابھی سے، اپنا پان کھا لو"

اس کی انگلیوں میں کیا اعجاز تھا، کون جانے ؟ موہن کی روح میں جیسے شادیانے بجنے لگے۔ اس کی جان روپا کے قدموں پر سر رکھنے کے لئے گویا اچھل پڑی دیوی برکتوں کا تھال لئے اس کے سامنے کھڑی ہے۔ ساری کائنات مسرت سے رقص کر رہی ہے۔ اسے معلوم ہوا جیسے اس کا جسم لطیف ہو گیا ہے اور وہ کسی صدائے مضطرب کی طرح فضا کے گودے چھٹا ہوا اس کے ساتھ رقص کر رہا ہے "میں جانتی ہوں نہیں جاگتے نہ جاگو۔ ہاں نہیں تو"

موہن اب ضبط نہ کر سکا "ہاں ذرا نیند آگئی تھی۔ تم اس وقت کیا کرنے آئیں کہیں اماں دیکھ لیں تو مجھے مار ہی ڈالیں"

روپا نے اس کے منہ میں پان کا بیڑا رکھ کر کہا "تم آج آئے کیوں نہیں؟"

"آج اماں سے لڑائی ہو گئی"

"کیا کہتی تھیں ؟"

"کہتی تھیں روپا سے بولو گے تو جان دے دوں گی"

"تم نے پوچھا نہیں روپا سے کیوں اتنا چڑھتی ہو ؟"

"اب ان کی بات کیا کہوں روپا، وہ کسی کا کھانا پینا نہیں دیکھ سکتیں۔"

"یہ بات نہیں ہے موہن۔ انہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔ میں چنچل تھی نہ۔ لیکن اب تو میں کسی سے نہیں ہنستی۔"

"اماں کو کیسے سمجھاؤں؟"

"تم میرے پاس ایک بار روز آجایا کرو۔ بس اور میں کچھ نہیں چاہتی۔"

دفعتہً موہن کے گھر کا دروازہ کھلا۔ شاید بوٹی آرہی ہے۔ روپا سرک گئی۔ موہن بھیگی بلّی بن گیا۔

۲

موہن دوسرے دن سو کر اٹھا۔ تو اس کے دل میں مسرت کا دریا موجزن تھا۔ اس کی خلقی خشونت اور تندی غائب ہو گئی تھی۔ گویا بچے کو مٹھائی مل گئی ہو۔ وہ سوہن کو ہمیشہ ڈانٹتا تھا۔ سوہن آرام طلب اور کاہل تھا۔ گھر کے کام دھندے سے جی چراتا تھا۔ آج بھی وہ آنگن میں بیٹھا اپنی دھوتی میں صابن لگا رہا تھا۔ غازی میاں کے میلے کی تیاری کر رہا تھا۔ موہن کو دیکھتے ہی اس نے صابن چھپا دیا۔ اور بھاگ جانے کے لئے موقعہ ڈھونڈنے لگا۔

موہن نے مخلصانہ تبسم کے ساتھ کہا۔ "کیا دھوتی بہت میلی ہو گئی ہے سوہن۔ دھوبی کو کیوں نہیں دے دیتے؟"

"دھوبن پیسے نہ مانگے گی؟"

"تو پیسے اماں سے کیوں نہیں مانگ لیتے؟"

"اماں پیسے دے چکیں۔ الٹی گھڑکیاں دیں گی۔"

"تو مجھ سے لے لو۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک اکنی اس کی طرف پھینک دی۔ سوہن باغ باغ ہو گیا۔ بھائی اور ماں دونوں اس کو ملامت کرتے رہتے تھے۔ بہت دنوں کے بعد آج اُسے محبت کی شیرینی کا مزا ملا۔ اکنی اُٹھالی اور دھوتی وہیں چھوڑ گائے کو کھولنے چلا۔

موہن نے کہا "تم رہنے دو میں اسے لئے جاتا ہوں۔"

سوہن نے گائے کو کھونٹے سے کھول کر باہر ناند پر باندھ دیا۔ اور اندر آ کر بھائی سے بولا "تمہارے لئے چلم رکھ لاؤں؟"

آج پہلی بار سوہن نے بڑے بھائی کی جانب ایسے حُسن عقیدت کا اظہار کیا۔ اس میں کیا راز ہے۔ یہ موہن کی سمجھ میں نہ آیا۔ برادرانہ خلوص سے اس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ بولا "آگ ہو تو رکھ لاؤ۔"

مینا سر کے بال کھولے آنگن میں گھروندا بنا رہی تھی۔ موہن کو دیکھتے ہی اس نے گھروندا بگاڑ دیا۔ اور آنچل سے سر ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی رسوئی گھر کی طرف برتن اُٹھانے چلی۔ موہن کے غصہ سے سب ہی ڈرتے تھے۔

موہن نے پیار سے پوچھا "کیا کھیل رہی تھی مینا؟"

مینا تھر تھر کانپتی ہوئی بولی "کچھ نہیں۔"

"تو تو بہت اچھے گھروندے بنا لیتی ہے۔ ذرا بنا تو دیکھوں۔"

موہن کے مزاج میں آج یہ پُر لطف انقلاب دیکھ کر مینا کو یکایک یقین نہ آیا۔ لیکن پھر بھی اس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ پیار کے ایک لفظ میں کتنا جادو ہے۔ منہ سے نکلتے ہی جیسے ایک دلکشی سی پھیل گئی۔ جس نے سُنا اس کا دل کھل اُٹھا۔ جہاں خوف اور بدگمانی تھی وہاں اعتبار اور خلوص چمک اُٹھا۔

جہاں بیکا ئگی تھی وہاں اپنا پا سا چھلک پڑا۔ چاروں طرف انہماک چھا گیا کہیں سُستی نہیں، کہیں بے دلی نہیں، کہیں بے نیازی نہیں ۔ لوگوں کی ترقیاں ہوتی ہیں۔ خطاب ملتے ہیں۔ مقدمات میں فتح ہوتی ہے۔ لیکن ان چھوٹے چھوٹے روز مرہ کے واقعات ہیں جو ... ہے وہ ان اوکھ اور گنّے کے کھیتوں میں کہاں موہن کے سینے میں آج محبت کا سوتا سا کھُل گیا تھا۔ اس میں مسرت، ہمدردی اور خلوص کی دھاریں سی نکل رہی تھیں۔

مینا گھروندا بنانے بیٹھ گئی ۔

موہن نے اس کے الجھے ہوئے بالوں کو سلجھا کر کہا "تیری گڑیا کا بیاہ کب ہوگا مینا ؟ جلد نیوتہ دے کچھ مٹھائی کھانے کو ملے "

مینا آسمان میں اُڑ رہی تھی ۔ بھیّا کتنے اچھے ہیں۔ اب بھیا پانی مانگیں گے تو وہ لوٹے کو راکھ سے خوب چماچم کر کے پانی لے جائے گی ؛

" اماں پیسے نہیں دیتیں، گڈا تو ٹھیک ہو گیا ہے لیکن ٹیکا کیسے بھیجوں ؟ کتنے پیسے لگیں گے ؟ "

" ایک پیسے کے بتاشے لوں گی اور ایک پیسہ کا گلابی رنگ، جوڑے تو رنگے جائیں گے کہ نہیں "

" تو دو پیسے میں تمہاری گڑیا کا بیاہ ہو جائے گا۔ کیوں ؟ "

" ہاں تم دو پیسے دے دو تو میری گڑیا کا دھوم دھام سے بیاہ ہو جائے "

موہن نے دو پیسے ہاتھ میں لے کر مینا کو دکھائے۔ مینا لپکی ۔ موہن نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ مینا نے ہاتھ پکڑ کے نیچے کھینچنا شروع کیا۔ جب یوں نہ پا سکی تو موہن کی گود میں چڑھ گئی اور پیسے لے لئے۔ پھر نیچے آکر ناچنے لگی۔ تب اپنی سہیلیوں کو شادی کا نوید سنانے دوڑی ۔

اسی وقت بوٹی گوبر کا جھوا لئے سار کے گھر سے نکلی۔ موہن کو کھڑے دیکھ کر تند لہجہ میں بولی: "ابھی تک سیر گشت ہی ہو رہی ہے۔ بھینسیں کب دوہی جائیں گی؟"

آج موہن نے بوٹی کو سخت جواب نہ دیا۔ ماں کو بوجھ سے دبے ہوئے دیکھ اس نے اضطراری طور پر اس کے سر سے جھوا لے کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

بوٹی نے کہا۔ "رہنے دے۔ جا کر بھینسیں دوہ لے۔ گوبر تو میں لئے جاتی ہوں۔"

"تم اتنا بھاری بوجھ کیوں اٹھا لیتی ہو ماں مجھے کیوں نہیں بلا لیتیں؟"

ماں کا دل مامتا سے رقیق ہو گیا۔

"تو جا اپنا کام دیکھ۔ میرے پیچھے کیوں پڑتا ہے؟"

"گوبر نکالنے کا کام میرا ہے۔"

"دودھ کون دوہے گا؟"

"وہ بھی میں کر لوں گا۔"

"تو اتنا کہاں کا جودھا ہے کہ سارے کام کر لے گا۔"

"جتنا کہتا ہوں اتنا کر لوں گا۔"

"تو میں کیا کروں گی؟"

"تم لڑکوں سے کام لو۔ جو بے راہ چلے اسے سمجھاؤ۔ جو غلطی دیکھو اسے ٹھیک کرو۔ بس یہی تمہارا کام ہے۔"

"میری سنتا ہے کوئی؟"

آج موہن بازار دودھ پہنچا کر لوٹا تو ایک چھوٹا سا پاندان، پان، کتھا، چھالیہ، اور تھوڑی سی مٹھائی لایا۔ بوٹی بگڑ کر بولی۔ "آج روپے کہیں

فالتو مل گئے تھے کیا ؟ ۔ اس طرح تو پیسے اُڑائے گا تو کے دن نباہ ہوگا ؟"

" میں نے تو ایک پیسہ بھی فضول خرچ نہیں کیا ۔ اماں ، میں سمجھتا تھا تم پان کھاتی ہی نہیں اسی لئے نہ لاتا تھا ۔"

" تو اب میں پان کھانے بیٹھوں گی ؟ "

" کیوں ۔ اس میں ہرج کیا ہے ؟ جس کے دو دو جوان بیٹے ہوں کیا وہ اتنا شوق بھی نہ کرے ؟ "

بوٹی کے سخت خزاں رسیدہ دل میں کہیں سے ہریالی نکل آئی ۔ ایک ننھی سی کونپل تھی ۔ لیکن اس کے اندر کتنی طراوت ، کتنی رطوبت ، جاں بخشی بھری ہوئی تھی ۔ جیسے اس کے چہرے کی جھرّیاں چکنی ہوگئیں ۔ آنکھوں میں نور آگیا ۔ دلِ مایوس میں ایک ترنّم سا ہونے لگا ۔ اس نے ایک مٹھائی سوہن کو دی ، ایک مینا کو ، اور ایک موہن کو دینے لگی ۔ موہن نے کہا ۔

" مٹھائی تو میں لڑکوں کے لئے لایا تھا اماں ۔"

" اور تو بوڑھا ہوگیا ۔ کیوں ؟ "

" ان لڑکوں کے سامنے تو بوڑھا ہی ہوں ۔"

" لیکن میرے سامنے تو لڑکا ہی ہے ۔"

موہن نے مٹھائی لے لی ۔ مینا نے مٹھائی کے پاتے ہی گپ سے منہ میں ڈال لی تھی اور وہ زبان پر مٹھاس کی لذّت چھوڑ کر گپ کی تعرفنا میں جا چکی تھی موہن کی مٹھائی کو للچائی آنکھوں سے دیکھنے لگی ۔ موہن نے وہ مٹھائی مینا کو دے دی ۔ ایک مٹھائی اور بچ رہی تھی ۔ بوٹی نے اسے موہن کی طرف بڑھا کر کہا ۔

" لایا بھی تو ذرا سی مٹھائی ۔"

موہن نے کہا ۔ " وہ تم کھا جانا اماں ۔"

"تمہیں کھاتے دیکھ کر مجھے جو خوشی ہو گی۔ اس میں مٹھاس سے زیادہ مزہ ہے"۔

موہن نے مٹھائی کھالی اور باہر چلا گیا۔ بوٹی پاندان کھول کر دیکھنے لگی۔ آج زندگی میں پہلی بار اُسے یہ خوش نصیبی حاصل ہوئی تھی۔ زہے نصیب کہ شوہر کے راج میں جو نعمت نہ میسّر ہوئی۔ وہ بیٹے کے راج میں ملی۔ پاندان میں کئی کلبیاں ہیں۔ اس میں چونا رہے گا۔ اس میں کتھا۔ اس میں چھالیہ۔ اس میں تمباکو۔ واہ! یہاں تو دو چھوٹی چھوٹی چمچیاں بھی ہیں۔ مزے سے چونا کتھا لگا لو۔ انگلی میں داغ نہ لگے۔ ڈھکنے میں کڑا لگا ہوا ہے۔ جہاں چاہو لٹکا کر لئے چلے جاؤ۔ اوپر کی طشتری میں پان رکھے جائیں گے۔ مگر سروتے کے لئے کہیں جگہ نہیں ہے، نہ سہی۔ اس نے پاندان کو مانجھ دھو کر اس میں چونا کتھا رکھا۔ چھالیہ کاٹ کر رکھی۔ پان بھگو کر طشتری میں رکھے تب ایک بیڑا لگا کر کھایا اس بیڑے کے عرق نے جیسے اس کی بیوگی کی کرختگی کو ملائم کر دیا۔ دل کی مسرت عنایت و کرم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اب بوٹی کیسے بیٹھی رہے۔ اس کا دل اتنا گہرا نہیں ہے۔ کہ یہ خوبیٔ قسمت اس میں جا کر گم ہو جائے۔ گھر میں ایک پرانا آئینہ پڑا ہوا تھا۔ بوٹی نے اس میں اپنا منہ دیکھا۔ ہونٹوں پر سُرخی نہیں ہے۔ منہ لال کرنے کے لئے اس نے تھوڑا ہی پان کھایا ہے۔ سُرخی ہوتی تو وہ کلّی کر لیتی۔ گاؤں کی ایک عورت دھنیا نے آکر کہا۔ "کاکی جرا رسی دیدو رسی ٹوٹ گئی ہے"۔

کل بوٹی نے صاف کہہ دیا تھا "میری رسّی گاؤں بھر کے لئے نہیں ہے۔ رسی ٹوٹ گئی ہے تو نوا کیوں نہیں لیتی"۔ لیکن آج اس نے اتنی کج خلقی سے کام نہیں لیا۔ اس نے خندہ پیشانی سے رسّی نکال کر دھنیا کو دے دی اور ہمدردانہ انداز سے پوچھا "لڑکے کے دست بند ہوئے یا نہیں دھنیا؟"

دھنیا نے کہا "نہیں کاکی۔ آج تو دن بھر دست آئے۔ جانوں دانت آ رہے ہیں۔"

"پانی بھر لے تو چل۔ ذرا دیکھوں دانت ہی ہے کہ کوئی اور رسا دہے کسی کی نجر ذجر تو نہیں لگی؟"

"کیا جانوں کاکی، کون جانے کسی کی آنکھیں پھوٹی ہوں۔"

"چونچال لڑکوں کو نجر کا بڑا ڈر رہتا ہے۔ جس نے چمکار کر بلایا اسی کی گود میں کھیلا جاتا ہے۔"

"کاکی ایسا سہد دن کی طرح ہنستا تھا کہ تم سے کیا کہوں؟"

"کبھی کبھی ماں کی نجر بھی لگ جاتی ہے بچے کو۔"

"اے نوج، کاکی بھلا کوئی اپنے بچے کو نظر لگائے گا۔"

"یہی تو تو سمجھتی نہیں۔ نجر کوئی لگاتا نہیں آپ ہی آپ لگ جاتی ہے۔"

دھنیا پانی لے کر آئی تو بوٹی اس کے ساتھ بچے کو دیکھنے چلی۔

"تو اکیلی ہے۔ آج کل تو گھر کے کام دھندے میں بڑا جھنجھٹ ہوتا ہوگا۔"

"نہیں کاکی۔ روپا آجاتی ہے اس سے بڑی مدد ملتی ہے، نہیں تو اکیلی میں کیا کرتی؟"

بوٹی کو تعجب ہوا۔ روپا کو اس نے محض تتلی سمجھ رکھا تھا۔ جس کا کام پھولوں پر بیٹھنا اور پھر اڑ جانا تھا۔ حیرت انگیز لہجہ میں بولی "روپا!"

"ہاں کاکی! بے چاری بڑی بھلی ہے۔ جھاڑو لگا دیتی ہے چوکا برتن کر دیتی ہے۔ لڑکے کو سنبھالتی ہے۔ گاڑھے سے کون کسی کی بات پوچھتا ہے کاکی؟"

"اسے تو اپنے مسی کاجل سے ہی چھٹی نہ ملتی ہوگی۔"

"یہ تو اپنی اپنی رُچ ہے کاکی۔ مجھے تو مسی کاجل والی نے جتنا سہارا دیا

اتنا کسی پوجا پاٹ والی نے نہ دیا۔ کل بے چاری رات بھر جاگتی رہی۔ میں نے اسے کچھ دے تو نہیں دیا، ہاں جب تک جیوں گی اس کا جس گاؤں گی۔"

"تو اُس کے گُن ابھی نہیں جانتی دھنیا۔ پان کے پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ رنگین ساڑھیاں کون لاتا ہے کچھ سمجھتی ہے؟"

"میں ان باتوں میں نہیں پڑتی کاکی۔ پھر سوک سنگار کرنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ کھانے پہننے کی یہی تو عمر ہے۔"

دھنیا کا گھر آگیا۔ آنگن میں ردپا بچے کو گود میں لے تھپکیاں دے رہی تھی۔ بچہ سو گیا تھا۔ دھنیا نے بچہ کو اس سے لے کر کھٹولے پر سلا دیا۔ بوٹی نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھا۔ پیٹ میں آہستہ آہستہ انگلی گڑ دکر دیکھا۔ ناف پر ہینگ کا لیپ کرنے کی تاکید کی۔ ردپا پنکھا لاکر اسے جھلنے لگی۔

بوٹی نے کہا "لا پنکھا مجھے دے دے۔"

"میں جھلوں گی تو کیا چھوٹی ہو جاؤ گی؟"

"تو دن بھر یہاں کام دھندا کرتی رہتی ہے تھک گئی ہو گی!"

"تم اتنی بھلی مانس ہو۔ ادھر یہاں لوگ کہتے ہیں بغیر گالی کے کسی سے بات نہیں کرتیں اس لئے تمہارے پاس آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔"

بوٹی مسکرائی۔ "لوگ جھوٹ تو نہیں کہتے۔"

"اپنی آنکھوں کی دیکھی مانوں یا کانوں کی سُنی۔" آج بھی ردپا آنکھوں میں کاجل لگائے پان کھائے رنگین ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ مگر آج بوٹی کو معلوم ہوا کہ پھول میں محض رنگ نہیں ہے بُو بھی ہے۔ اُسے ردپا سے جو ایک طرح کا للّٰہی بغض تھا وہ آئینہ پر جمے ہوئے گرد کی طرح صاف ہو گیا تھا۔ کتنی نیک سیرت، کتنی سُگھڑ اور شرمیلی لڑکی ہے۔ آواز کتنی پیاری ہے۔ آج کل کی لڑکیاں اپنے بچوں کی تو

پرواہ نہیں کرتیں۔ دوسروں کے لئے کون مرتا ہے۔ ساری رات دھنیا کے بچے کو لئے جاگتی رہی۔ موہن نے کل کی باتیں ماں سے کہہ تو دی ہوں گی۔ دوسری لڑکی ہوتی تو مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتی اسے تو جیسے کچھ معلوم ہی نہیں۔ ممکن ہے موہن نے اس سے کچھ کہا ہی نہ ہو۔ ضرور یہی بات ہے۔

آج روپا پہلے سے بہت حسین معلوم ہوئی۔ ٹھیک تو ہے۔ ابھی شوق سنگار نہ کرے گی تو کب کرے گی۔ شوق سنگار اس لئے برا لگتا ہے کہ ایسے آدمی اپنے ہی عیش و آرام میں مست رہتے ہیں۔ کسی کے گھر میں آگ لگ جائے ان سے مطلب نہیں۔ ان کا کام تو صرف دوسروں کو رجھانا ہے۔ جیسے اپنے روپ کو سجائے راہ چلتوں کو بلاتے ہوں کہ ذرا اس دکان کی سیر بھی کرتے جائیے۔ ایسے نیک دل آدمیوں کا سنگار برا نہیں لگتا۔ بلکہ اور اچھا لگتا ہے۔ کون نہیں چاہتا کہ لوگ اس کے روپ کی تعریف کریں۔ کون دوسروں کی نظر میں کھب جانا نہیں چاہتا۔ بوٹی کا شباب کب کا رخصت ہو چکا تھا۔ پھر بھی یہ تمنا اس کے دل میں موجود تھی۔ زمین پر پاؤں نہیں پڑتے۔ پھر روپا تو ابھی جوان ہے۔

روپا اب قریب قریب روز دو ایک بار بوٹی کے گھر آتی۔ بوٹی نے موہن سے تقاضا کر کے اس کے لئے اچھی سی ساڑی منگوا دی۔ اگر روپا بغیر کاجل لگائے یا محض سفید ساڑھی پہنے آ جاتی تو بوٹی کہتی "بہو بیٹیوں کو یہ جوگیا بھیس اچھا نہیں لگتا۔ یہ بھیس تو ہم بوڑھوں کے لئے ہے"۔

روپا کہتی "تم بوڑھی کس طرح ہو گئیں اماں! مردوں کو اشارہ مل جائے تو بھونروں کی طرح منڈلانے لگیں۔ میرے دادا تو تمہارے دروازے پر دھرنا دینے لگیں"۔

بوٹی لطف آمیز ملامت کے ساتھ کہتی "چل میں تیری ماں کی سوتن

گر جاؤں گی۔"

"اماں تو بوڑھی ہو گئیں۔"

"تو کیا تیرے دادا جوان بیٹھے ہیں۔"

"ہاں اماں! بڑی اچھی کاٹھی ہے ان کی۔"

آج موہن بازار سے دودھ بیچ کر لوٹا تو بوڑھی نے کہا: "کچھ روپے پیسے کی فکر کر بھائی۔ میں روپا کی ماں سے روپا کے لئے تیری بات چیت پکّی کر رہی ہوں۔"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

عید گاہ

رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی ہے۔ کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچہ کی طرح پُر تبسم، درختوں پر کچھ عجیب ہریادل ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھو کتنا پیارا ہے گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارکباد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عید گاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کرتے میں بٹن نہیں ہیں تو سوئی تاگا لینے دوڑا جا رہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں۔ اسے تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں۔ عید گاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سینکڑوں رشتے قرابت داروں

ہے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا۔ وہ بھی دوپہر تک۔ کسی نے وہ بھی نہیں۔ لیکن عیدگاہ جانے کی خوشی ان کا حصّہ ہے۔ روزے بڑے بوڑھوں کے لئے ہوں گے۔ بچوں کے لئے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے۔ آج وہ آگئی۔ اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عیدگاہ کیوں نہیں چلتے۔ انہیں گھروں کی فکروں سے کیا واسطہ؟ سویّوں کے لئے گھر میں دودھ شکر اور میوے ہیں یا نہیں۔ اس کی انہیں کیا فکر۔ وہ کیا جانیں ابّا کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں۔ ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہو کر رکھ لیتے ہیں۔ ان ہی دو چار پیسوں میں دنیا کی ساری نعمتیں لائیں گے۔ کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل۔ اور خدا جانے کیا کیا اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد۔ وہ چار سال کا غریب صورت بچّہ ہے جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہو گیا۔ اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مر گئی۔ کسی کو پتہ نہ چلا کیا بیماری ہے۔ کہتی کس سے، کون سننے والا تھا۔ دل پر جو گزرتی تھی سہتی تھی۔ اور جب نہ سہا گیا تو دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے۔ اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس کے ابّا جان بڑی دور روپے کمانے گئے ہیں۔ بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے! امّی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لئے خاموش ہے۔ حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے۔ جس کا گوٹا سیاہ ہو گیا ہے پھر بھی وہ خوش ہے۔ جب اس کے ابّا جان تھیلیاں اور امّاں جان نعمتیں لے کر آئیں گی تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔ تب دیکھے گا کہ محمود اور محسن،

نورانی سیمیں کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا اپنی مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے اس کی ایک نگاہ معصوم اسے پامال کرنے کے لئے کافی ہے۔"

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے "تم ڈرنا نہیں اماں! میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا۔" لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو۔ نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی ننھی سی جان۔ تین کوس چلے گا۔ پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سوّیاں کون پکائے گا۔ بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا۔ کیا اس وقت سوّیاں پکانے بیٹھے گی۔ رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس نے فہیمن کے کپڑے سئے تھے۔ آٹھ آنے پیسے ملے تھے۔ اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آئی تھی اس عید کے لئے لیکن کل گھر میں اور پیسے نہ تھے اور گوالن کے پیسے چڑھ گئے تھے۔ دینے پڑے۔ حامد کے لئے روز دو پیسے کا دودھ تو لینا پڑتا ہے۔ اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں۔ یہی بساط ہے۔ اللہ ہی بیڑا پار کرے۔ دھوبن حجّامن اور نائن سبھی تو آئیں گی۔ سب کو سوّیاں چاہئیں۔ کس کس سے منہ چھپائے سال بھر کا تہوار ہے۔ زندگی خیریت سے رہے۔ ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے بچے کو خدا سلامت رکھے۔ یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے۔ اور بچوں کے ساتھ حامد بھی تھا۔ سب کے سب دوڑ کر آگے نکل جاتے۔ پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے۔ یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں؟

شہر کا سودا شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں

پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔ حامد نے ایک کنکری اٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا۔ مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔ بچے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں۔ مالی کو کیسا اُلو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔ یہ عدالت ہے، یہ مدرسہ ہے، یہ کلب گھر ہے اتنے بڑے مدرسے میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے۔ لڑکے نہیں ہیں جی۔ بڑے بڑے آدمی ہیں۔ سچ اُن کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے اب تک پڑھتے جاتے ہیں۔ آج تو چھٹی ہے۔ لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے تو بہت سے ڈاڑھی والے لڑکے یہاں کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کب تک پڑھیں گے اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر۔ گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں۔ بالکل کوڑن غبی۔ کام سے جی چرانے والے۔ یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی۔ اور کیا نہیں۔ کیا اب تک پڑھتے ہوتے۔ وہ کلب گھر ہے وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے۔ سُنا ہے مُردوں کی کھوپڑیاں اُڑتی ہیں۔ آدمی کو بیہوش کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں، وہ سب بتلا دیتا ہے۔ اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں۔ سچ، ہماری اماں کو وہ دے دو۔ کیا کہلاتا ہے "بیٹ" تو اسے گھماتے ہی لڑھک جائیں۔

محسن نے کہا "ہماری امی جان تو اسے پکڑ ہی نہ سکیں۔ ہاتھ کانپنے لگے اللہ قسم"

حامد نے اس سے اختلاف کیا "چلو، منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں۔ ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گی تو ہاتھ کانپنے لگے گا۔ سینکڑوں گھڑے پانی روز نکالتی ہیں۔ کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں تلے اندھیرا آ جائے"

محسن: "لیکن دوڑتی تو نہیں، اچھل کود نہیں سکتیں"

حامد "کام آپڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں۔ ابھی اُس دن تمہاری گائے کھل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی تو تمہاری اماں ہی دوڑ کر اسے بھگا لائی تھیں۔ کتنی تیزی سے دوڑی تھیں۔ ہم تم دونوں اُن سے پیچھے رہ گئے۔"

پھر آگے چلے۔ حلوائیوں کی دُکانیں شروع ہوئیں۔ آج خوب سجی ہوئی تھیں اتنی مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھو نا ایک ایک دوکان پر منوں ہوں گی۔ سُنا ہے رات کو ایک جنات ہر ایک دکان پر جاتا ہے۔ جتنا مال بچا ہوتا ہے وہ سب خود خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپے دیتا ہے۔" بالکل ایسے ہی چاندی کے روپے۔

محمود کو یقین نہ آیا۔ "ایسے روپے جنات کو کہاں سے مل جائیں گے؟"

محسن "جنات کو روپوں کی کیا کمی؟ جس خزانہ میں چاہیں چلے جائیں۔ کوئی انہیں دیکھ نہیں سکتا۔ لوہے کے دروازے تک نہیں روک سکتے جناب، آپ ہیں کس خیال میں۔ ہیرے جواہرات اُن کے پاس رہتے ہیں۔ جس سے خوش ہو گئے اُسے ٹوکروں جواہرات دے دیئے۔ پانچ منٹ میں کہو کابل پہنچ جائیں۔"

حامد "جنات بہت بڑے ہوتے ہوں گے۔"

محسن "اور کیا۔ ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔ زمین پر کھڑا ہو جائے، تو اس کا سر آسمان سے جا لگے۔ مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھس جائے۔"

سمیع "سُنا ہے چودھری صاحب کے قبضہ میں بہت سے جنات ہیں کوئی چیز چوری چلی جائے چودھری صاحب اس کا پتہ بتا دیں گے۔ اور چور کا نام تک بتا دیں گے۔ جمعراتی کا بچھڑا اس دن کھو گیا تھا۔ تین دن حیران ہوئے کہیں نہ ملا۔ تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے۔ چودھری نے کہا مویشی خانہ میں ہے اور وہیں ملا۔ جنات آکر انہیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں۔"

اب ہر ایک سمجھ میں آگیا کہ چودھری قاسم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے اور کیوں وہ قرب و جوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں۔ جنات آکر انہیں روپے دے جاتے ہیں۔ آگے چلئے۔ یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ، لپ، پھام، پھو۔!

نوری نے تصحیح کی "یہاں پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔ جب ہی تمہیں بہت خبر ہے۔ اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں۔ رات کو یہ سب ایک محلہ میں چوروں سے کہتے ہیں چوری کرو اور دوسرے محلے میں پکارتے ہیں جاگتے رہو۔ میرے ماموں ایک تھانہ میں سپاہی ہیں۔ بیس روپے مہینہ پاتے ہیں لیکن تھیلیاں بھر بھر کے گھر بھیجتے ہیں۔ اللہ قسم تھیلیاں بھر بھر کے۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا۔ ماموں اتنے روپے آپ کہاں سے لاتے ہیں۔ ہنس کر کہنے لگے، بیٹا اللہ دیتا ہے۔ خود ہی بعد کو کہا کہ ہم لوگ چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں مار لائیں۔ ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ ہو اور نوکری بنی رہے۔

حامد نے تعجب سے پوچھا "یہ لوگ چوری کراتے ہیں تو انہیں کوئی پکڑتا نہیں۔"

نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا "ارے احمق۔ انہیں کون پکڑے گا۔ پکڑنے والے تو یہ خود ہیں۔ لیکن اللہ انہیں سزا بھی خوب دیتا ہے تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا مال متاع جل گیا۔ ایک برتن تک نہ بچا۔ کئی دن تک درخت کے نیچے سوئے تھے اللہ قسم! پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔"

بستی گھنی ہونے لگی۔ عید گاہ جانے والوں کے مجمع نظر آنے لگے۔ ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے۔ کوئی تانگے پر سوار کوئی موٹر پر، چلتے تھے،

تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو آرہی تھی

بستی گھنی ہونے لگی۔ عیدگاہ جانے والوں کی ٹولیاں نظر آنے لگیں۔ ایک سے عالم میں مگن، صابر و شاکر بنی جاتی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے تاکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی۔ محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔

وہ عیدگاہ نظر آئی۔ جماعت شروع ہوگئی ہے۔ اوپر املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے۔ نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے جس پر جاجم بچھا ہوا ہے۔ اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسری۔ خدا جانے کہاں تک چلی گئی ہیں۔ پختہ فرش کے نیچے جاجم بھی نہیں۔ کئی قطاریں کھڑی ہیں، جو آتے ہیں پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔ اسلام کی نگاہ میں سب انسان برابر ہیں۔ دہقانوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہوگئے۔ کتنی باقاعدہ منظم جماعت ہے۔ لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں، ایک ساتھ دوزانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں۔ کتنا پُراحترام، رعب انگیز نظارہ ہے۔ جس کی ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا اخوت کا رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کیے ہوئے ہے۔

۲

نماز ختم ہو گئی ہے۔ لوگ باہم گلے مل رہے ہیں۔ کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات دے رہے ہیں۔ جو آج یہاں ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں۔

دہقانوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دکانوں پر یورش کی۔ بوڑھے ان دلچسپیوں
میں بچوں سے کم محظوظ نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے۔ ایک پیسہ دے کر آسمان
پر جاتے معلوم ہوں گے۔ کبھی زمین پر گرتے۔ یہ چرخی ہے، لکڑی کے گھوڑے،
اونٹ، ہاتھی میخوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس
چکروں کا مزا لو۔ محمود اور محسن ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ نور اور سمیع گھوڑوں پر۔
ان کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں۔ حامد دور کھڑا
ہے۔ تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکر کھانے کے لئے وہ اپنے خزانہ
کا ثلث نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ اسے بار بار چرخی پر بلاتا ہے لیکن وہ
راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آگیا۔
حامد سوچتا ہے کیوں کسی کا احسان لوں۔ عسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ
ذکی الحس بنا دیا ہے۔

سب لوگ چرخی سے اترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔
سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بہشتی بے امتیاز ران
سے ران ملائے بیٹھے ہیں۔ دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے۔ بہشتی وکیل صاحب
کی بغل میں۔ واہ کتنے خوبصورت، بولا ہی چاہتے ہیں۔ محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا
ہے۔ خاکی وردی اور لال پگڑی۔ کندھے پر بندوق۔ معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد
کے لئے چلا آرہا ہے۔ محسن کو بہشتی پسند آیا۔ کمر جھکی ہوئی ہے۔ اس پر مشک کا
دہانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے۔ دوسرے ہاتھ میں رسی ہے۔ کتنا بشاش
چہرہ ہے۔ شاید کوئی گیت گا رہا ہے۔ مشک سے پانی انڈیلا ہوا معلوم ہوتا
ہے۔ نوری کو وکیل سے مناسبت ہے۔ کیسی عالمانہ صورت ہے۔ سیاہ چغہ
نیچے سفید اچکن، اچکن کے ... میں ... سنہری زنجیر، ایک ہاتھ میں

قانون کی کتاب لئے ہوئے ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آرہے ہیں۔ یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں۔ حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں۔ اگر دو کا ایک کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا۔ نہیں کھلونے فضول ہیں۔ کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے۔ ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا۔ کس مصرف کے ہیں۔

محسن کہتا ہے "میرا بہشتی روز پانی دے جائے گا صبح و شام"

محمود "اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا۔ کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فیر کر دے گا"

نوری "اور میرا وکیل روز مقدمے لڑائے گا۔ اور روز روپے لائے گا"

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے۔ مٹی ہی کے تو ہیں۔ گریں تو چکنا چور ہو جائیں لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لئے انہیں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دکان ہے۔ طرح طرح کی ضروری چیزیں! ایک چادر بچھی ہوئی ہے۔ گیند، سیٹیاں، بگل، بھونرے، ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ محسن ایک سیٹی لیتا ہے، محمود گیند، نوری ربڑ کا بطخ پسند کرتا ہے۔ اور سمیع ایک خنجری۔ اسے بجا بجا کر وہ گائے گا۔ حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کے رفیق کوئی چیز خرید لیتے ہیں تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے لئے لپکتا ہے۔ لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جبکہ ابھی دلچسپی تازہ ہے۔ بچارا یوں ہی مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا۔ کسی نے ریوڑیاں لی ہیں کسی نے

گلاب جامن کسی نے سوہن حلوا۔ مزے سے کھا رہے ہیں۔ حامد اُن کی برادری سے خارج ہے۔ کم بخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں۔ کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا "حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہیں؟"

حامد سمجھ گیا یہ محض شرارت ہے۔ محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس گیا۔ محسن نے دونے سے دو تین ریوڑیاں نکالیں۔ حامد کی کی طرف بڑھائیں۔ حامد نے ہاتھ پھیلایا۔ محسن نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور ریوڑیاں اپنے منہ میں رکھ لیں محمود اور نور اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے حامد کھسیانا ہو گیا۔

محسن نے کہا "اچھا اب ضرور دیں گے۔ یہ لے جاؤ حامد اللہ قسم"

حامد نے کہا "رکھیے رکھیے۔ کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں؟"

سمیع بولا "تین ہی پیسے تو ہیں۔ کیا کیا لو گے؟"

محمود "تم اس سے مت بولو۔ حامد میرے پاس آؤ۔ یہ گلاب جامن لے لو"

حامد "مٹھائی کون بڑی نعمت ہے۔ کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں"

محسن "لیکن جی میں کہہ رہے ہو گے کہ کچھ مل جائے تو کھا لیں۔ اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے"

محمود "میں اس کی ہوشیاری سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑھا چڑھا کر کھائے گا"

حلوائیوں کی دکانوں کے آگے کچھ دکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ

گلٹ اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لئے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا
حامد لوہے کی دکان پر ایک لمحہ کے لئے رُک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے
تھے۔ وہ دست پناہ خریدے گا۔ ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے
سے روٹیاں اُتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں
کو دے دے تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔ پھر اُن کی اُنگلیاں کبھی نہ جلیں گی۔
گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ۔ مفت میں پیسے
خراب ہوتے ہیں۔ ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے۔ پھر تو اُنہیں کوئی آنکھ اٹھا کر
بھی نہیں دیکھتا۔ یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائیں گے یا چھوٹے
بچے جو عیدگاہ نہیں جا سکے ہیں۔ ضد کر کے لے لیں گے اور توڑ ڈالیں گے۔
دست پناہ کتنے فائدہ کی چیز ہے! روٹیاں توے سے اتار لو چولہے سے آگ
نکال کر دے دو۔ اماں کو کہاں فرصت ہے۔ بازار آئیں۔ اور اتنے پیسے
کہاں ملتے ہیں۔ روز ہاتھ جلا لیتی ہیں۔ اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔
سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں۔ سب نے اتنی مٹھائیاں
لیں۔ کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو۔ میری
تختی دھو لاؤ۔ اب اگر میاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا۔ کھائیں
مٹھائیاں، آپ منہ سڑے گا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔ آپ ہی چٹوری
زبان ہو جائے گی۔ تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے۔ میری زبان
کیوں خراب ہو گی۔ اس نے پھر سوچا۔ اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر
میرے ہاتھ سے لے لیں گی۔ اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی اماں کے لئے دست پناہ
لایا ہے۔ ہزاروں دعائیں دیں گی۔ پھر اسے پڑوسیوں کو دکھائیں گی۔ سارے
گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ ان لوگوں کے کھلونوں پر کون انہیں دعائیں

دے گا۔ بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں اور فوراً قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں۔ میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا وہ کھلونے کھیلیں مٹھائیاں کھائیں۔ میں غریب سہی۔ کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی۔ پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا۔ کتنے کھلونے لو گے۔ ایک ایک کو ایک ایک ٹوکری دوں اور دکھا دوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ جتنے غریب لڑکے ہیں سب کو اچھے اچھے کرتے دلا دوں گا۔ اور کتابیں دے دوں گا۔ یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑیاں لیں تو چڑھا چڑھا کر کھانے لگے۔ دست پناہ دیکھ کر سب کے سب خوب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دکاندار سے پوچھا۔ "یہ دست پناہ بیچو گے:"

دکاندار نے اس کی طرف دیکھا۔ اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا۔

"وہ تمہارے کام کا نہیں ہے۔"

"بکاؤ ہے یا نہیں؟"

"بکاؤ ہے جی۔ اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں؟"

"تو بتلاتے کیوں نہیں کے پیسے کا دو گے؟"

"چھ پیسے لگیں گے۔"

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا۔ "تین پیسے لو گے؟" اور آگے بڑھا کہ دکاندار کی گھڑکیاں نہ سنے۔ مگر دکاندار نے گھڑکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لئے۔

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا گویا بندوق ہے۔ اور شان

سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

محسن نے ہنستے ہوئے کہا "یہ دست پناہ لایا ہے۔ احمق اسے کیا کرے گا؟"

حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا "ذرا اپنا بہشتی زمین پر گرا دو۔ ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچا کی۔"

محمود "تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے!"

حامد "کھلونا کیوں نہیں ہے۔ ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا۔ ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔ چاہوں تو اس سے تمہاری ناک پکڑ لوں۔ ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمہارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ!"

سمیع متاثر ہو کر بولا "میری خنجری سے بدلو گے۔ دو آنے کی ہے۔"

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا "میرا دست پناہ چاہے تو تمہاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلی لگا دی۔ ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔ میرا بہادر دست پناہ آگ میں، پانی میں، آندھی میں، طوفان میں، برابر ڈٹا کھڑا رہے گا۔"

میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے۔ حامد ہے بڑا ہوشیار!

اب دو فریق ہو گئے۔ محمود، محسن اور نوری ایک طرف، حامد یکہ و تنہا دوسری طرف۔ سمیع غیر جانبدار رہے۔ جس کی فتح دیکھے گا اس کی طرف جائے

گا۔ مناظرہ شروع ہو گیا۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحادِ ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے۔ حامد کے پاس حق اور اخلاق، ایک طرف مٹی، ربڑ اور لکڑی کی چیزیں دوسری جانب اکیلا لوہا۔ جو اس وقت اپنے کو فولاد کہہ رہا ہے وہ روئیں تن ہے صف شکن ہے اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آجائے تو میاں بہشتی کے اوسان خطا ہو جائیں۔ میاں سپاہی مٹی کی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے چغے میں منہ چھپا کر زمین پر لیٹ جائیں مگر یہ رستم ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا۔ اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔"

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا۔ "اچھا تمہارا دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا!"

حامد نے دست پناہ کو سیدھا کر کے کہا۔ "یہ بہشتی کو ایک ڈانٹ بتائے گا، تو دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا۔ جناب جس سے چاہے گھڑے مٹکے اور کونڈے بھر ڈالو۔"

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا۔ نوری نے کمک پہنچائی۔ بچہ گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے۔ تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے اس کے لئے جناب!"

حامد کے پاس اس وار کا دفعیہ اتنا آسان نہ تھا۔ دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا۔ "اسے پکڑنے کون آئے گا؟"

محمود نے کہا "یہ سپاہی بندوق والا۔"

حامد نے منہ چڑھا کر کہا "یہ کیا بےچارے اس رستم ہند کو پکڑیں گے؟ اچھا

لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچّہ کی ماں مر جائے گی پکڑیں گے کیا بچارے۔"

محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا "تمہارے دست پناہ کا منہ روز آگ میں جلے گا۔"

حامد کے پاس جواب تیار تھا۔ "آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب۔ تمہارے یہ وکیل اور سپاہی اور بہشتی ڈرپوک ہیں۔ سب گھر میں گھس جائیں گے آگ میں کودنا وہ کام ہے جو رستم ہی کر سکتا ہے۔"

نوری نے انتہائی جرأت سے کام لیا "تمہارا دست پناہ باورچی خانہ میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے میز کرسی لگا کر بیٹھے گا۔" اس جملہ نے مُردوں میں بھی جان ڈال دی۔ سمیع بھی جیت گیا "بے شک بڑے معرکے کی بات کہی۔ دست پناہ باورچی خانہ میں پڑا رہے گا۔"

حامد نے دھاندلی کی "میرا دست پناہ باورچی خانہ میں نہیں رہے گا۔ وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انہیں زمین پر پٹک دے گا۔ اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا۔"

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی۔ بالکل بے تکی سی بات تھی۔ لیکن قانون پیٹ میں ڈالنے والی بات چھا گئی۔ ایسی چھا گئی کہ تینوں سورما منہ تکتے رہ گئے۔ حامد نے میدان جیت لیا۔ گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیند، سیٹی اور بعض ریزرو تھے۔ مگر ان مشین گنوں کے سامنے ان بٹاخوں کو کون پوچھتا۔ دست پناہ رستم ہند ہے۔ اس میں کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہیں۔

فاتح کو مفتوحوں سے وقار اور خوشامد کا خراج ملتا ہے وہ حامد کو ملنے لگا۔ اوروں نے تین تین آنے خرچ کئے اور کوئی کام کی چیز نہ لے سکے۔ حامد

نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا۔ کھلونوں کا کیا اعتبار۔ دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا ہمیشہ۔ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔

محسن نے کہا "ذرا اپنا چمٹا دو۔ ہم بھی دیکھیں۔ تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھو حامد کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ فیاض طبع فاتح ہے۔ دست پناہ باری باری سے محسن محمود اور سمیع کے ہاتھ میں گیا اور انکے کھلونے باری باری سے حامد کے ہاتھ میں آئے۔ کتنے خوبصورت کھلونے ہیں معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں مگر ان کھلونوں کیلئے انہیں دعا کون دیگا کون کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا اسے اپنے طرز عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے پھر اب تو دست پناہ رستم ہے اور سب کھلونوں کا بادشاہ۔ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑیاں لیں۔ اس میں حامد کو بھی خراج ملا۔ حالانکہ وہ انکار کرتا رہا۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لئے۔ حامد کو بھی خراج ملا۔ یہ سب رستم ہند کی برکت تھی۔

۳

گیارہ بجے سارے گاؤں میں چہل پہل ہو گئی۔ میلے والے آگئے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بہشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور مارے خوشی کے جو اچھلی تو میاں بہشتی نیچے آرہے۔ اور عالم جاودانی کو سدھارے۔ اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے۔ ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں۔ دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کئے۔ میاں نوری کے وکیل صاحب کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کے پوزیشن کا لحاظ تو کرنا ہی ہوگا۔ دیوار میں دو

کھونٹیاں گاڑی گئیں ۔ اُن پر چیڑ کا ایک پُرانا پڑا رکھا گیا۔ پڑے پر سُرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا۔ جو بمنزلہ قالین کے تھا۔ وکیل صاحب عالم بالا پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہیں سے قانونی بحث کریں گے۔ نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالم بالا سے دُنیائے فانی میں آرہے۔ اور اُن کے جسدِ خاکی کے پُرزے پُرزے ہوگئے پھر بڑے زور شور کا ماتم ہوا۔ اور وکیل صاحب کی میّت پارسی دستور کے مطابق گھورے پر پھینک دی گئی۔ تاکہ بیکار نہ جا کر زاغ و زغن کے کام آجائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی۔ محترم اور ذی رُعب ہستی ہے۔ اپنے پیروں چلنے کی ذلّت اُسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنا بکری کا بچّہ پکڑا اور اس پر سپاہی کو سوار کیا۔ محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی۔ اور محمود بکری کے بچّہ کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے "چھونے والے جاگتے لہو" پکارتے چلتے تھے، معلوم نہیں کیا ہوا۔ میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لئے زمین پر آرہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہوگئی۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں، محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نگم اور بھاٹیہ اس کی شاگردی کرسکتے ہیں۔ اور یہ ٹوٹی ٹانگ کو آناً فاناً میں جوڑ دے گا۔ صرف گولر کا دودھ چاہیئے۔ گولر کا دودھ آتا ہے۔ ٹانگ جوڑی جاتی ہے۔ لیکن جوں ہی کھڑا ہوتا ہے ٹانگ پھر الگ ہوجاتی ہے۔ عمل جراحی ناکام ہوجاتا ہے۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے۔ اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو نہ چل سکتا تھا، نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر

ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصہ سنئے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی۔ اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

"یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹا؟"

"میں نے مول لیا ہے تین پیسے میں"۔

امینہ نے چھاتی پیٹ لی"۔ یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہوگئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ۔ سارے میلے میں تجھے اور کوئی چیز ہی نہ ملی"۔

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا "تمہاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں"۔

امینہ کا غصہ فوراً شفقت میں تبدیل ہوگیا۔ اور شفقت بھی وہ نہیں جو پُر بیان ہوتی ہے۔ اور اپنی ساری تاثیر لفظوں میں منتشر کردیتی ہے۔ یہ بے بیان شفقت تھی، درد، التجا میں ڈوبی ہوئی۔ اُف! کتنی نفس کشی ہے کتنی جاں سوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لئے کتنا ضبط کیا ہوگا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے۔ اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا کیونکر! اپنی بڑھی اماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا علوی جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آجائے۔ اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کردے۔

اور تب ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن

گئی۔ وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا۔ اور نہ شاید ہمارے ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

سکونِ قلب

مرحوم مرلی ناتھ میرے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ آج بھی جب
ان کی یاد آجاتی ہے۔ تو وہ پُر لطف صحبتیں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں اور
ذرا دیر رو لیتا ہوں۔ ہمارے درمیان دو ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا میں
لکھنؤ میں، وہ دہلی میں، مگر شاید ہی کوئی ایسا مہینہ گذرتا ہو کہ ہم آپس میں
نہ مل جاتے ہوں۔ آزاد، روشن خیال، زندہ دل، یار باش، وفا پرور آدمی
تھے جس نے اپنے اور پرائے میں کبھی امتیاز نہیں کیا۔ دُنیا کیا چیز ہے اور یہاں
ذمہ داریوں کا کیسے نباہ ہوتا ہے۔ یہ اس شخص نے کبھی نہ جاننے کی کوشش
کی۔ زندگی میں ایسے موقعے بار بار آئے۔ جب انہیں آئندہ کیلئے عبرت ہوتی

چاہئے تھی۔ دوستوں نے ان کی علو ہمتی سے ناجائز فائدے اٹھائے کئی بار شرمندگی بھی ہوئی لیکن اس مرد خدا نے زندگی سے کوئی سبق لینے کی قسم کھالی تھی اس کی روش میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ وہ جیسے سہل اعتقاد تھے، ویسے ہی سہل اعتقاد رہے جس وقت میں وہ رہتے تھے وہ نرالی دنیا تھی جس میں بدگمانی اور دوراندیشی اور حیلہ سازی کا شائبہ تک نہ تھا۔ سب اُن کے اپنے تھے۔ کوئی غیر نہ تھا۔ میں نے انہیں حقائق زندگی سے متنبہ کرنے کی بار بار کوشش کی۔ مگر اس کا اثر ہمیشہ توقع کے خلاف ہوا۔ وہ کبیدہ خاطر ہو جاتے اور معلوم ہوتا تھا کہ انہیں مصلحت آمیزانہ خیراندیشیوں سے روحانی صدمہ ہوتا ہے۔ مجھے اکثر یہ فکر ہوتا تھا کہ ان کی فیاضیوں کا اگر یہی حال رہا تو اس کا انجام کیا ہوگا مگر مصیبت یہ تھی کہ ان کی بیوی گویا بھی کچھ اس سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ہماری دیویوں میں جو احتیاط عموماً برتی جاتی ہے اور ہمیشہ ایسے لاابالی مزاج مردوں کی کم اندیشیوں پر اسپر ایک کام کرتی ہے۔ وہ گویا مفقود تھی۔ یہاں تک کہ اُسے زیور اور کپڑوں سے بھی کوئی خاص رغبت نہ تھی چنانچہ جب مجھے سری ناتھ کی وفات کی خبر ملی۔ اور میں دہلی گیا تو گھر میں بجز برتن بھانڈے اور مکان کے کوئی اثاثہ باقی نہ تھا اور ابھی مرحوم کی عمر ہی کیا تھی۔ چالیس سال بھی تو پورے نہ ہوئے تھے۔ پہلے ایک لڑکی ہوئی تھی، اس کے بعد دو لڑکے تو کم عمری میں داغ دے گئے۔ لڑکی بچ رہی تھی، اس کا چودھواں سال تھا۔ اور یہی اس ناٹک کا سب سے دردناک حصہ تھا جس معاشرت کا یہ کنبہ عادی تھا اس کے لئے اس اختصار کے باوجود کم سے کم سو روپیہ ماہوار کی ضرورت تھی۔ اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اور دو ڈھائی سال میں لڑکی کی شادی بھی کرنی ہے۔ اس کی سبیل کیا ہوگی۔ میری عقل کچھ کام

نہ کرتی تھی۔ مجھے اس وقت یہ بیش بہا تجربہ ہوا کہ جو لوگ واقعی بے لوث، نیک طینت اور دوست پرور ہوتے اور قرض سے ہمیشہ پاک رہتے ہیں۔ اُن کے پسماندوں کو آڑے دینے والوں کی کمی نہیں رہتی۔ یہ کوئی عام قاعدہ نہیں ہے۔ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے، جنہوں نے زندگی میں بہتوں کے ساتھ سلوک کئے مگر ان کے بعد کسی نے ان کے عیال کی بات تک نہ پوچھی۔ لیکن چاہے کچھ بھی ہو، سری ناتھ کے احباب نے قابلِ تعریف وفاداری سے کام لیا۔ اور گوپا کے گذران کے لئے ایک مستقل رقم جمع کر دینے کی تجویز کی۔ امید ایک صاحب تو اس سے شادی کرنے کو بھی تیار تھے۔ مگر گوپا نے اس خودداری کا ثبوت دیا، جو ہماری دیویوں کا جوہر ہے۔ اور کسی کی دستِ نگر نہ ہی۔ اس نے اپنے مکان کا بڑا حصہ کرایہ پر اُٹھا دیا۔ اور خود اس کے ایک حصہ میں گذارا کرنے لگی پچیس روپے اس کے لئے کافی تھے۔ لڑکی ایک مدرسہ میں پڑھتی تھی۔ جو کچھ خرچ تھا۔ اس کی ذات سے تھا۔ گوپا کے لئے تو اب زندگی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

۲

اس کے ایک ہی مہینے بعد مجھے کاروبار کے سلسلہ میں یورپ جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں مجھے امید کے خلاف دو سال لگ گئے۔ وہاں میں برابر گوپا سے خط و کتابت کرتا رہتا تھا، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زندگی اطمینان سے بسر ہو رہی ہے۔ تردد کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گوپا نے یہاں بے ضرورت پردہ داری برتی اور مجھے غیر سمجھ لیا۔ انگلینڈ سے واپس آنے پر میں سیدھا دلی پہنچا۔ دروازہ پر پہنچتے

ہی مجھے بے اختیار رونا آگیا اور در و دیوار سے حسرت برس رہی ہے۔ جس کمرے میں احباب کے جمگھٹے رہتے تھے اس کے دروازے بند تھے۔ اور مکڑیوں کے جالے ان کی پاسبانی کر رہے تھے۔ مرحوم کی وہ مانوس آواز جسے سن کر میں اپنے سارے غم بھول جاتا تھا۔ اس کی جگہ ایک ماتمی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری ناتھ دروازے پر کھڑے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ میں باطل پرست نہیں ہوں۔ اور ارواح کی جسمانیت میں مجھے شبہ ہے۔ لیکن اس وقت میں ذرا دیر کے لئے چونک ضرور پڑا۔ اور میرے دل میں ایک ارتعاش سا ہونے لگا۔ لیکن دوسری نظر میں وہ صورت غائب ہو چکی تھی۔ میں نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ دروازہ کھلا گویا کے سوا کھولنے والا ہی کون تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر دل تھام لیا۔ اگرچہ اسے میرے آنے کی خبر تھی اور آج میری آمد کے انتظار میں اس نے نئی ساڑھی پہن لی تھی اور شاید بالوں میں کنگھی بھی کر لی تھی۔ لیکن ان دو برسوں میں قدرت نے اس کے ساتھ جو ستم کیا تھا۔ اسے کیا کرتی۔ یہ وہ سن ہے جب حسن اپنے پورے شباب پر آتا ہے۔ جب اس میں بے نیازی اور الھڑپن اور استغنا کی جگہ کشش اور جلادت پیدا ہو جاتی ہے لیکن گویا بوڑھی ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر جھریاں تھیں، جسے ارادی بشاشت بھی دور نہ کر سکی تھی۔ بالوں پر سفیدی دوڑ چلی تھی۔ اور ایک ایک عضو خستہ حالی کی شہادت دے رہا تھا۔ سوگوار آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میں نے رقت آمیز لہجہ میں پوچھا۔

"کیا تم بیمار تھیں گویا؟"

گویا نے جواب دیا "نہیں تو۔ مجھے سر کا درد بھی کبھی نہیں ہوا۔"

"تو تمہاری یہ کیا حالت ہے؟ بالکل بوڑھی ہو گئی ہو۔"

"تو اب جوانی لے کر کیا کروں گی۔ میری عمر بھی تو پینتیس سے اوپر ہو گئی"۔

"پینتیس کی عمر تو بہت زیادہ نہیں ہوتی"۔

"ہاں ان کے لئے جو بہت جینا چاہتے ہیں۔ میں تو چاہتی ہوں جتنی جلدی ہو سکے زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ بس ستی کے بیاہ کی فکر ہے۔ اس سے نجات پا جاؤں۔ پھر مجھے زندگی کی پرواہ نہ رہے گی۔

اب معلوم ہوا کہ جو صاحب اس گھر میں کرایہ دار ہوئے وہ چند مہینوں کے بعد تبدیل ہو کر چلے گئے اور جب سے کوئی دوسرا کرایہ دار نہ آیا۔ میرے دل میں برچھی سی چبھ گئی۔ ان دو برس تک ان غریبوں کی کیونکر بسر ہوئی یہ خیال ہی جگر دوز تھا۔

میں نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔ "لیکن تم نے مجھے ان حالات کی بالکل اطلاع نہ دی۔ تم نے مجھے بالکل غیر سمجھ لیا"۔

گوپا نے نادم ہو کر کہا "میں نے سمجھا تم پردیس میں خود ہی پریشانیوں میں مبتلا ہو گے۔ تمہیں کیوں ستاؤں۔ کسی نہ کسی طرح دن کٹ گئے۔ گھر میں اور کچھ نہ تھا تو۔ تھوڑے سے زیور تو رکھتے ہی۔ اب سیتا کی شادی کی فکر ہے پہلے میں نے سمجھا تھا اس مکان کو بیچ کر دوں گی۔ بیس بائیس ہزار مل جائیں گے۔ شادی بھی ہو جائیگی اور شاید کچھ میرے لئے بچ رہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ مکان پہلے ہی رہن ہو چکا ہے اور اصل اور سود مل کر بیس ہزار ہو گیا ہے۔ مہاجن کی اتنی بڑی عنایت کیا کم تھی کہ مجھے گھر سے نکال دیا۔ اس لئے اب ادھر سے بھی کوئی امید نہیں ہے۔ شاید منت سماجت کرنے پر دو ہزار اور مل جائیں۔ اتنے میں کیا ہوگا۔ اسی فکر میں گھلی جا رہی ہوں لیکن میں بھی کتنی خود غرض ہوں۔ تمہیں ہاتھ دھونے کو پانی تک نہ دیا۔ چھوٹا منہ

کبھی نہ لائی۔ اور اپنا دُکھڑا لے بیٹھی۔ اب کپڑے اُتار دیجیے۔ کچھ کھانے کو پکاؤں۔ کھا پی لیجیے۔ تب باتیں ہوں۔ مکان پر تو سب خیریت ہے؟"

میں نے کہا "میں تو سیدھا لمبئی سے یہاں آ رہا ہوں۔ گھر کہاں گیا؟"

گوپا نے مجھے ملامت آمیز آنکھوں سے دیکھا۔ مگر اس ایک جملہ میں خدا جانے کیا جادو تھا، معجزہ تھا، اس کے چہرے کی ساری جھریاں مٹ گئیں۔ اور زرد چہرہ پر ایک ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی اور ملامت میں کتنا استحسان، کتنی محبت، کتنا اعتماد، کتنی مسرت بھری ہوئی تھی۔ وہ شخص جو کسمپرسی اور عُسرت دبے نوائی کے ہاتھوں پامال ہو رہا تھا، نمودار ہو گیا۔

"اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری دیوی جی تمہیں کبھی یہاں نہ آنے دیں گی۔"

"میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔"

"کسی کو اپنا غلام بنانے کے لئے خود بھی اس کا غلام بننا پڑتا ہے۔"

شام ہو رہی تھی۔ جاڑوں کے دن تھے۔ سُنیتا مدرسے سے آئی۔ دو سال پہلے کی الھڑ چھوکری، اس وقت حسین اور خوش قامت لڑکی تھی جس کی ہر ایک جنبش، ہر ایک نگاہ، ہر ایک بات ایک ادا تھی جسے میں گود میں اٹھا کر پیار کرتا تھا اس کی طرف آنکھیں نہ اُٹھا سکا۔ اور وہ جو میرے گلے سے لپٹ کر خوش ہوتی تھی آج میرے سامنے کھڑی بھی نہ رہ سکی۔ جیسے مجھ سے کوئی چیز چھپانا چاہتی ہے۔ اور جیسے میں اس چیز کو چھپانے کا موقعہ دے رہا ہوں۔

میں نے پوچھا "اب تم کس درجہ میں پہنچیں سُنی؟"

اس نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا "دسویں میں ہوں"

"گھر کا بھی کچھ کام کاج کرتی ہو؟"

"اماں جب کرنے بھی دیں۔"
گوپا بولی "یہ میاں ہی نہیں کرنے دیتی یا تو خود کسی کام کے قریب نہیں جاتی۔"
شنی منہ پھیر کر سہمی ہوئی چلی گئی۔ماں کی دلاری لڑکی تھی، جس دن وہ رسوئی میں جا کر کچھ کام کرتی، اس دن شاید گوپا رو رو کر آنکھیں پھوڑ لیتی۔ وہ خود لڑکی کو کوئی کام نہ کرنے دیتی تھی، مگر سب سے شکایت کرتی تھی کہ وہ کوئی کام نہیں کرتی۔ شکایت بھی اس کے پیار کا ہی ایک کرشمہ تھی۔
میں کھانا کھا کر لیٹا تو گوپا نے شنی کی تیاریوں کا ذکر شروع کیا! اس کے سوا اس کے پاس اور بات ہی کیا تھی۔ لڑکے تو بہت ملتے تھے لیکن کچھ حیثیت بھی تو ہو۔ لڑکی کو یہ سوچنے کا موقعہ ہی کیوں ملے کہ دادا زندہ ہوتے تو شاید میرے لئے زیادہ اچھا گھر تلاش کرتے۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے لالہ مداری لال کے لڑکے کا ذکر کیا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ لالہ مداری لال پہلے ایگزیکٹو انجینیر تھے۔ اب پنشن پاتے تھے۔ لاکھوں روپے جمع کر لئے تھے۔ پر اب تک ان کی حرص کی پیاس نہ بجھی تھی۔ ساری دنیا کی دولت کھینچ کر اپنے گھر میں بھر لینا چاہتے تھے۔ گوپا نے گھر بھی وہ چھانٹا جہاں اس کی رسائی مشکل تھی۔
میں نے اعتراض کیا۔ لالہ مداری لعل تو بڑے بد دماغ آدمی ہیں۔"
گوپا نے تردید کی۔ "نہیں۔ تم نے ابھی انہیں پہچانا نہ ہو گا۔ میرے اوپر بہت مہربان ہیں۔ کبھی کبھی آ کر خیر و عافیت پوچھ جاتے ہیں۔ لڑکا ایسا قبول صورت ہے کہ میں تم سے کیا کہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھگوان نے اسے شنی ہی کے لئے بنایا ہے۔ انجینیر صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میں تم سے جہیز وغیرہ نہیں چاہتا۔
میں نے سمجھا وہ پہلی اعتقادی جس نے سری ناتھ کو تباہ کیا۔ گوپا پر بھی غالب ہے میں نے بھی خیال کیا کہ کیوں کسی سے بدگمانی کروں۔ ممکن ہے مداری لال کی طبیعت

دولت سے سیر ہو گئی ہو۔ میں نے نیم راضی ہو کر کہا۔

"مگر یہ تو سوچو کہ ان کی حیثیت تم سے کتنی زیادہ ہے۔ شاید تم اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی ان کا منہ نہ سیدھا کر سکو۔" لیکن گوپا کے دل میں بات جم گئی تھی۔ مداری لال نے اس پر جادو ڈال دیا تھا۔ سُنی کو وہ ایسے گھر میں بیاہنا چاہتی تھی، جہاں وہ رانی بن کر رہے۔

گوپا نے میری باتوں پر التفات نہ کیا۔ وہ بولی "مداری لال بہت ہی شریف اور بے لوث آدمی ہیں۔ تم ان سے مل کر خوش ہو گے۔ صبح ان کے پاس جا کر اس معاملہ کو طے کر دو۔ میں اب تک ان سے صاف نہیں کہہ سکی لیکن مجھے امید ہے کہ جہیز کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا۔ میں بیوہ ہوں، غریب ہوں، بےکس ہوں، مجھ پر رحم کریں گے۔"

دوسرے دن سویرے میں لالہ مداری لال کے پاس گیا اور ان سے میری گفتگو ہوئی۔ ان نے مجھے ان کا مداح بنا دیا۔ کسی زمانے میں وہ سخت گیر رہے ہوں گے۔ اس وقت تو بہت منکسر المزاج، بے حد خلیق، نہایت وضعدار بزرگ تھے۔ بولے "بھائی صاحب میں سری ناتھ جی سے واقف ہوں۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ ان کی لڑکی میرے گھر میں آئے یہ میری خوش نصیبی ہے۔ آپ اس کی ماں سے کہہ دیں کہ مداری لال ان سے کسی چیز کا طالب نہیں ایشور کا دیا ہوا میرے گھر میں بہت کچھ ہے۔ وہ کوئی تردد نہ کریں میں انہیں زیر بار نہیں کرنا چاہتا۔"

میرے دل کا بوجھ اُتر گیا۔ ہم سُنی سُنائی باتوں سے دوسروں کے متعلق کتنی غلط رائے قائم کر لیا کرتے ہیں۔ اس کا خوشگوار تجربہ ہوا۔ میں خوش لوٹا اور گوپا کو اس خوش قسمتی پر مبارک باد دی۔ یہ فیصلہ ہوا کہ گرمیوں میں شادی

ہو جائے۔ اسی دن میں لکھنؤ چلا گیا۔

۳

یہ چار مہینے گوپا نے شادی کی تیاریوں میں صرف کئے۔ میں مہینہ میں
ایک بار ضرور اس سے مل آتا تھا لیکن ہر بار غمناک اثر لے کر آتا۔ گوپا نے اپنی
خاندانی عظمت کا خدا جانے کیا معیار دل میں قائم کر لیا تھا۔ غریب اس وہم
میں پڑی ہوئی تھی کہ اس کی علو ہمتی شہر میں اپنی یادگار چھوڑ جائے گی۔ یہ نہ
جانتی تھی کہ یہاں ایسے تماشے روز ہوتے ہیں۔ اور دوسرے ہی دن بھلا دئے
جاتے ہیں۔ شاید وہ دنیا سے یہ خراج لینا چاہتی ہے کہ اس بے نوائی اور
بے سر و سامانی میں بھی لٹا ہوا ہاتھی نو لاکھ کا ہے۔ قدم قدم پہ اسے سری ناتھ
کی یاد آتی۔ وہ ہوتے تو یہ کام یوں ہوتا یوں نہ ہوتا۔ اور پھر وہ روتی۔ مداری
لعل شریف آدمی ہیں۔ اس سے کسی چیز کے خواستگار نہیں۔ لیکن اس کا بھی
تو لڑکی کے ساتھ کچھ فرض ہے۔ سنی کے لئے اس نے جتنے زیور اور جوڑے
تیار کئے۔ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ جب دیکھئے کچھ نہ کچھ سی رہی ہے۔ کبھی
سناروں کی دکان پر بیٹھی ہوئی ہے۔ کبھی بازار سے مہمانوں کی ضیافت کے
سامان خرید رہی ہے۔ محلے میں شاید ہی کوئی ایسا خوشحال آدمی تھا جس سے
اس نے قرض نہ لیا ہو۔ وہ اسے قرض سمجھتی تھی، مگر دینے والے امداد سمجھ کر
دیتے تھے۔ سارا محلہ اس سے ہمدردی کر رہا تھا۔ سُنی اب محلہ کی لڑکی تھی۔
گوپا کی عزت کے ساتھ محلے والوں کی عزت بھی وابستہ ہے اور گوپا کے لئے
تو نیند اور آرام حرام۔ درد سے سر پھٹا جا رہا ہے۔ آدھی رات ہو گئی ہے مگر
وہ بیٹھی کچھ نہ کچھ سی رہی ہے۔ کتنا بلند حوصلہ تھا کسی بات کی مطلق پروا نہ کرتی

اکیلی عورت اور وہ بھی نیم جان اور نحیف، کیا کیا کرے۔ جو کام خود نہیں کرتی اس میں کچھ نہ کچھ کسر رہ جاتی ہے۔ مگر اس کی ہمّت ہے کہ کسی طرح نہیں ہارتی پچھلی بار کی ملاقات میں بھی اس کی حالت دیکھ کر مجھے بڑی فکر ہوئی۔ میں نے کہا گویا اگر مرنا ہی چاہتی ہو تو شادی ہو جانے کے بعد مرو۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں اس سے قبل ہی پر دانہ نہ آجائے۔

گویا کا پژمردہ چہرہ کھل اٹھا۔ بولی۔ اس کی فکر نہ کرو بھیا۔ بیوہ بڑی سخت جان چیز ہے لیکن آرزو یہی ہے کہ سُنی کا ٹھکانہ لگا کر میں بھی چل دوں۔ اب ادرجی کر گیا کرونگی، کیا کروں۔ اگر کسی طرح کی بے عنوانی ہوئی تو کس کی بدنامی ہوگی۔ ان چار مہینوں میں مشکل سے رات کو ایک گھنٹے سوئی ہوں گی۔ نیند ہی نہیں آتی۔ مگر میرا دل خوش ہے، میں مروں یا جیوں مجھے اطمینان تو ہو گا کہ سنی کے لئے جو کچھ کر سکتی تھی وہ میں نے کر دیا۔ مداری لال نے شرافت کا ثبوت دیا تو مجھے بھی ان کی شرافت کا جواب دینا ہے۔

اسی وقت ایک دیوی نے آکر گویا سے کہا: "بہن چل کر ذرا دیکھ لو۔ چاشنی ٹھیک ہو گئی ہے یا نہیں۔" گویا اس کے ساتھ چاشنی کا معائنہ کرنے گئی اور ایک لمحہ کے بعد آکر بولی: "جی چاہتا ہے سر پیٹ لوں۔ تم سے ذرا باتیں کرنے لگی۔ ادھر چاشنی اتنی سخت ہو گئی کہ لڈو دانتوں سے مڑیں گے۔ کس سے کیا کہوں۔" میں نے کہا: "تم ناحق یہ دردسری مول لے رہی ہو۔ کیوں نہیں کسی حلوائی کو بلا کر مٹھائیوں کا ٹھیکہ دے دیتیں۔ پھر تمہارے یہاں مہمان ہی کتنے آئیں گے جن کے لئے یہ طومار باندھ رہی ہو۔ دس پانچ روپے کی مٹھائی ان کے لئے کافی ہو گی۔"

گویا نے میری طرف دردناک آنکھوں سے دیکھا! ان میں آنسو کے قطرے

بھرے ہوئے تھے! بھیا۔ تم یہ باتیں نہ سمجھو گے۔ تمہیں نہ ماں بننے کا اتفاق ہوا ہے نہ بیوی بننے کا۔ ستّی کے بابو جی کا کتنا نام تھا۔ ان کی کتنی عزّت تھی۔ کتنے آدمیوں کو اُن سے فیض پہنچتا تھا۔ وہ پگڑی میرے ہی تو سر بندھی ہے۔ تمہیں شاید یقین نہ آئے مگر میں تو انہیں ہمیشہ اپنے اندر بیٹھا ہوا پاتی ہوں۔ جو کچھ کر رہے ہیں وہ کر رہے ہیں میں بے عقل اکیلی عورت کیا کر لیتی۔ وہی میرے رہبر ہیں۔ وہی میرے مشیر ہیں۔ وہی میرے مددگار ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ یہ قالب میرا ہے۔ لیکن اس کے اندر جو روح ہے وہ اُن کی ہے۔ تم ان کے دوست ہو۔ لیکن تم نے اپنے سینکڑوں روپے بھی خرچ کئے اور داد و دہش بھی کر رہے ہو۔ میں تو ان کی بیوی ہوں، دُنیا میں بھی اور عاقبت میں بھی!" یہ سُن کر میں لاجواب ہو گیا۔

۴

جون میں شادی ہو گئی۔ گوپا نے بہت کچھ دیا۔ اور اپنی حیثیت سے بہت زیادہ دیا۔ لیکن اسے تسکین نہ تھی۔ آج ستّی کے دادا ہوتے تو نہ جانے کیا کرتے برابر روتی رہی۔ جاڑوں میں مَیں پھر دہلی گیا۔ میں نے سمجھا تھا کہ اب گوپا خوش ہو گی لڑکی اچھے گھر میں پہنچ گئی ہے اور آرام سے ہے۔ گوپا کے لئے اس کے سوا اور کیا چاہئے۔ لیکن خوشی شاید اس کی تقدیر میں نہ تھی۔

میں اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔ گھر بار سب اچھا ہے۔ ساس سسر سب اچھے ہیں لیکن داماد آوارہ مزاج ہے۔ ستّی بے چاری بیوہ ہو کر دن کاٹ رہی ہے۔ تم اسے دیکھو تو پہچان نہ سکو بالکل سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ ابھی کئی دن ہوئے آئی تھی۔ جیسے زندگی میں اپنا راستہ کھو بیٹھی ہو۔ نہ تن بدن کی سُدھ ہے نہ کپڑے لتّے کی۔ میری ستّی

کی یہ حالت ہو گئی اس کا تو مجھے خواب میں بھی گمان نہ تھا۔ بالکل گم سم ہو گئی ہے کتنا پوچھا۔ بیٹی وہ تجھ سے کس بات سے ناراض ہے۔ لیکن جواب ہی نہیں دیتی۔ آنکھوں سے آنسو گرتے رہتے ہیں۔ میری سُنی کنوئیں میں گر گئی"۔

میں نے پوچھا "لیکن اس میں کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی ہی۔ تم نے کسی اور سے نہیں دریافت کیا"

گوپا بولی "پوچھا کیوں نہیں بھیّا۔ سب حال معلوم ہو گیا۔ وہ کہتا ہے میں جو چاہے کروں مگر سُنی میری پوجا کرتی رہے۔ سُنی بھلا اسے کیوں برداشت کرنے لگی۔ اسے تو تم جانتے ہو کتنی خود دار لڑکی ہے۔ وہ ان عورتوں میں نہیں ہے جو شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں۔ اور اس کی ہر ایک جا بے جا حرکت کو برداشت کرتی ہیں۔ اس نے ہمیشہ لاڈ اور پیار پایا ہے۔ باپ بھی ہمیشہ اس پر جان دیتا تھا۔ میں بھی اس کی ناز برداری کرتی تھی۔ شوہر ملا رنگین مزاج جو آدھی رات تک مارا مارا پھرتا ہے۔ دونوں میں نہ معلوم کیا بات ہوئی۔ لیکن مجھے تو ایسا اندیشہ ہو رہا ہے کہ دونوں میں کوئی گانٹھ پڑ گئی ہے۔ نہ وہ سُنی کی پروا کرتا ہے نہ سُنی اس کی پرواہ کرتی ہے۔ مگر وہ تو اسی طرح اپنے رنگ میں مست ہے سُنی رو رو کر آنکھیں پھوڑے ڈالتی ہے"۔

میں نے کہا "لیکن تم نے سُنی کو سمجھایا نہیں۔ لڑکے کا کیا بگڑا گیا۔ وہ تو کل دوسری شادی کر لے گا۔ سُنی کی زندگی تو خراب ہو جائے گی"۔ گوپا کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے "بھیّا کس دل سے سمجھاؤں، اسے دیکھ کر تو میری چھاتی پھٹنے لگتی ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ اسے اپنے کلیجے میں رکھ لوں کہ اسے کوئی گرم آنکھ سے دیکھ ہی نہ سکے۔ سُنی آرام طلب ہوتی، بدسلیقہ ہوتی، تند مزاج ہوتی تو سمجھاتی بھی۔ کیا یہ سمجھاؤں کہ تیرا شوہر گلی گلی آوارہ پھرتا پھرے، پھر بھی تو

اس کی پوجا کیا کرے میں کیا یہ ذلت پسند کرتی۔ میاں بیوی میں نباہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں بالکل ایک ہو جائیں۔ ایسے مرد تو بہت کم ہیں جو عورت میں جوہر انحراف بھی گوارا کر سکیں۔ لیکن ایسی عورتیں بھی ہیں جو شوہر کو آزاد سمجھتی ہیں۔ شنی ان عورتوں میں نہیں ہے۔ وہ اگر دل و جان شوہر کی نذر کرتی ہے۔ تو یہ چاہتی ہے کہ وہ اپنا جل و جان اس کی نذر کرے اور اگر شوہر بے وفا ہو تو اس سے کوئی تعلق نہ رکھے گی۔ چاہے اس کی زندگی رو رو کٹے"

مجھ سے یہ کہہ کر گوپا اندر گئی اور ایک صندوقچہ اٹھا لائی۔ اور مجھے اس کے اندر کے زیور دکھا کر بولی "شنی اب کے اسے یہیں چھوڑ گئی۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو میں نے نہ جانے کن کن پریشانیوں سے بنوائی تھی۔ ان کے پیچھے مہینوں ماری ماری پھری تھی۔ شنی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی ہے۔ پہنے تو کس کے لئے، سنگار کرے تو کس پر، پانچ صندوق کپڑوں کے دئے تھے کپڑے سیتے سیتے میری آنکھیں پھوٹ گئیں۔ شنی اب کے سارے کپڑے اٹھا لائی۔ ان چیزوں سے اسے جیسے نفرت ہو گئی ہے۔ بس ہاتھ میں کانچ کی دو چوڑیاں اور معمولی ساری یہی اس کا سنگار ہے۔

میں نے گوپا کو تشفی دیتے ہوئے کہا "میں جا کر ذرا شنی کے شوہر سے ملوں گا اور اسے سمجھا بجھا کر راستے پر لانے کی کوشش کروں گا"

گوپا نے میری طرف ہاتھ جوڑ کر کہا "نہیں بھیا۔ بھول کر بھی نہ جانا شنی سنے گی تو جان ہی دے دے گی۔ بڑی مغرور ہے۔ وہ میرا مغرور ہے۔ اسے رسی سمجھ لو جس کے جل جانے پر بھی بل نہیں جاتا جن پیروں نے اسے ٹھکرایا ہے وہ نہیں کبھی نہ سہلائیگی اسے اپنا بنا کر چاہے تو لونڈی بنالے۔ لیکن حکومت تو اس نے میری نہیں برداشت کی دوسروں کی کیا کرے گی۔" میں نے گوپا سے تو اس وقت

کچھ نہ کہا۔ لیکن موقعہ ملتے ہی لالہ مرادی لال کے پاس گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اصلی حقیقت کا پتہ لگاؤں۔ اتفاق سے لالہ صاحب اور ان کے صاحبزادے کیدار دونوں ایک ہی جگہ مل گئے۔ شاید ان میں کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کیدار نے اس طرح جھک کر میرے قدم چھوئے کہ میں اس کی سعادت مندی پر فریفتہ ہو گیا۔ چائے، پان، مٹھائی اور مربّے سے میری خاطر کی۔ اتنا مؤدب اتنا شائستہ اور سلیم الطبع نوجوان میری نظر سے نہ گذرا تھا۔ یہ گمان ہی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ شخص ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ اور ہو سکتا ہے۔ جب میں کچھ پوچھتا بڑے ادب سے سر جھکا کر جواب دیتا اور بلا ضرورت ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالتا۔

جب کیدار ٹینس کھیلنے چلا گیا تو میں نے لالہ مرادی لال سے کہا کہ مجھے کیدار بالو بہت شائستہ مزاج معلوم ہوتے ہیں پھر میاں بیوی میں کیوں یہ بدمزگی پیدا ہو گئی ہے؟"

مرادی لال نے تامل کے ساتھ کہا "اس کا سبب اس کے سوا اور کیا بتاؤں کہ دونوں اپنے ماں باپ کے لاڈلے ہیں اور پیار بچوں کو شوریدہ سر بنا دیتا ہے۔ میری ساری زندگی کشمکش میں گذری۔ اب ضعیفی میں جا کر ذرا اطمینان نصیب ہوا ہے۔ نفس پروری کا کبھی موقعہ نہ ملا۔ دن بھر مزدوری کرتا تھا۔ شام کو پڑ کر سو رہتا تھا۔ صحت خراب تھی ہی، ہمیشہ یہ فکر سوار رہتا تھا کہ کچھ جمع کر لوں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے بعد بیوی بچے دوسروں کے دست نگر ہو جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان حضرت کو مفت کی دولت ملی، جو فرمائش کرتے تھے وہ پوری ہو جاتی تھی۔ پڑھنا لکھنا تو درکنار، کھیلنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس پر ہزاروں روپے پھونک دئیے۔ پڑھنا لکھنا تو درکنار، بس ڈرامہ کی دھن رہنے لگی۔ رنگ اور گہرا ہوا۔ اپنی زندگی کا ڈرامہ کھیلنے لگے۔ میں نے یہ دیکھا تو سوچا کہ جلدی سے شادی کر دوں۔ راہ راست پر

آجائے گا۔ گوپا دیوی نے پیغام دیا تو میں نے فوراً منظور کر لیا۔ میں نے انکی لڑکی کو دیکھا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ حسین بیوی پاکر اس کی طبیعت یکسو ہو جائے گی مگر وہ بھی لاڈلی لڑکی تھی۔ زمانہ کے نشیب و فراز سے ناواقف۔ رواداری کی حقیقت سے محروم، وہ احترازت اسے زیر کرنا چاہتی ہے، یہ بے اعتنائی سے میں تو صاحب اس معاملہ میں بہو کو زیادہ خطا دار سمجھتا ہوں۔ لڑکوں میں بالعموم ذمہ داری کا خیال کم ہوتا ہے۔ لڑکیاں فطرتاً زیادہ ذمہ دار ہوتی ہیں۔ اور اپنی خدمت اور قربانی سے شوہر کو اپنی جانب مائل کر لیتی ہیں۔ بہو میں یہ بات نہیں، بس یہی بدمزگی کا سبب ہے۔ بظاہر دونوں بڑے مہذب، بڑے نیک، بڑے متحمل مزاج۔ لیکن ایک کے باطن میں خودداری اور تکبر کا جنون ہے۔ دوسرے کے باطن میں آزادروی۔ کج فہمی کا فتنہ کشتی کیسے پار ہوگی یہ خدا ہی جانے۔"

یکایک سُنی اندر سے آگئی۔ چہرہ زرد، آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے گویا جسم میں خون ہی نہیں ہے۔ پامالی آرزوؤں کی اس سے بہتر تصویر نہیں ہو سکتی شکوہ آمیز لہجہ میں بولی "آپ نہ جانے کب سے بیٹھے ہیں اور مجھے خبر تک نہ دی اور شاید آپ باہر ہی باہر چلے بھی جاتے"

میں نے کہا "نہیں سُنی۔ یہ کس طرح ممکن تھا۔ تمہارے پاس آ ہی رہا تھا کہ تم خود آگئیں"

لالہ مداری لال کمرہ کے باہر جا کر اپنی کار کی صفائی کا انتظام کرنے لگے۔ شاید مجھے موقعہ دینا چاہتے تھے کہ سُنی سے کچھ باتیں کروں۔

سُنی نے پوچھا "اماں تو اچھی طرح ہیں؟"

"ہاں اچھی طرح ہیں۔ لیکن تم نے یہ کیا گت بنا رکھی ہے؟"

"میں تو بہت اچھی طرح ہوں"

"یہ بات کیا ہے تم لوگوں میں یہ آن بَن کیوں ہے؟ گوپا دیدی نگر میں جان دے ڈالتی ہیں۔ تم خود اپنی جان دینے کو تیار معلوم ہو رہی ہو۔ کچھ دور اندیشی سے کام لو۔"

"آپ نے یہ ناگوار بحث چھیڑ دی چچاجی! میں نے تو اس خیال سے اپنے کو تسکین دے لی کہ میری تقدیر خراب ہے۔ بس اس کا علاج میرے امکان میں نہیں۔ میں اس زندگی سے موت کو بدرجہا بہتر سمجھتی ہوں جہاں اپنی قدر نہ ہو۔ میں وفا کے بدلے وفا چاہتی ہوں۔ زندگی کی کوئی اور صورت میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس معاملہ میں کسی کا سمجھوتہ کرنا میرے لئے غیر ممکن ہے۔ نتیجہ کی پرواہ نہیں کرتی۔"

"لیکن ....."

"نہیں چچاجی، اس معاملہ میں آپ کچھ نہ کہئے۔ ورنہ میں چلی جاؤں گی۔"

"آخر سوچو تو ..."

"میں سب سوچ چکی۔ اور طے کر چکی۔ حیوان کو آدمی بنانا میری قدرت سے باہر ہے۔"

اس کے بعد میرے لئے بجز خاموشی کے اور کیا رہ گیا تھا۔

۵

مئی کا مہینہ تھا۔ میں منصوری گیا ہوا تھا کہ گوپا کا تار پہنچا: "فوراً آیئے بہت ضروری کام ہے۔ میں گھبرا تو گیا لیکن اتنا یقین تھا کہ کوئی سانحہ نہیں ہوا ہے۔ دوسرے ہی دن دہلی پہنچا۔ گوپا میرے روبرو آ کر کھڑی ہو گئی۔ بے زبان، بے حس، بے جان، جیسے تپ دق کی مریض ہو۔

میں نے پوچھا: "خیریت تو ہے۔ میں تو گھبرا اُٹھا۔"

اس نے بجھی بجھی آنکھوں سے دیکھا اور بولی "سچ!"

"سُنی خیریت ہے تو ہے؟"

"ہاں اچھی طرح ہے"

"اور کیدار ناتھ"

"وہ بھی اچھی طرح ہیں"

"تو پھر ماجرا کیا ہے ؟"

"کچھ بھی نہیں !"

"تم نے تار دیا اور کہتی ہو کچھ بھی نہیں"

"دل گھبرا رہا تھا اس لئے تمہیں بلا لیا۔ سُنی کو کسی طرح سمجھا بجھا کر یہاں لانا ہے میں تو سب کچھ کر کے تھک گئی"

"کیا کوئی نئی بات ہو گئی ؟"

"کیدار ایک ایکٹریس کے ساتھ کہیں بھاگ گیا ہے۔ ایک ہفتہ سے اس کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ سُنی سے کہہ گیا ہے کہ جب تک تم رہو گی گھر نہ آؤں گا۔ سارا گھر سُنی کا دشمن ہو رہا ہے لیکن وہ وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیتی۔ سُنتا ہے جنیک سے اپنے باپ کے دستخط بنا کر کئی ہزار روپے اُڑا لے گیا ہے"

"تم سُنی سے مل آئیں ؟ تو پھر اسے زبردستی کیوں بلا رہی ہو۔ وہ نہیں آنا چاہتی تو رہنے دو"

"وہاں گھٹ کر مر جائے گی"

میں اُلٹے قدموں لالہ مداری لعل کے گھر پہنچا۔ تو دیکھا کہرام مچا ہوا ہے۔ میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ وہاں جنازہ تیار ہو رہا تھا۔ محلہ کے صدہا آدمی جمع تھے۔ گھر میں ہائے ہائے کی صدا آ رہی تھی۔ یہ سُنی کی لاش تھی۔

مداری لعل مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ گئے "بھائی صاحب! میں تو لُٹ گیا۔ لڑکا بھی گیا۔ بہو بھی گئی۔ افسوس!"

معلوم ہوا جب سے کیدار چلا گیا تھا سُنی پہلے سے بھی زیادہ مغموم رہتی تھی اس نے اسی دن اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں اور مانگ کا سیندور پونچھ ڈالا تھا۔ ساس نے جب اُسے بُرا بھلا کہا تو اُن سے بھی اُلجھ گئی ۔ مداری لال نے سمجھانا چاہا تو ان کو بھی جلی کٹی سُنائیں ۔ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ میں فتور آگیا ہے۔ لوگوں نے اس سے کچھ کہنا چھوڑ دیا ۔ آج صبح جمنا اشنان کرنے گئی ۔ اندھیرا تھا سارا گھر سو رہا تھا کسی کو جگایا بھی نہیں ۔جب یہاں بہو گھر میں نہ ملی تو تلاش ہونے لگی ۔ بڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ جمنا گئی ہے ۔ لوگ اُدھر بھاگے ۔ وہاں بہت تلاش کے بعد اس کی لاش ملی ہے ۔ ابھی تھوڑے دن پہلے جو پالکی پر سوار ہو کر آئی تھی آج چار کے کاندھے پر جا رہی ہے ۔میں میت کے ساتھ ہو لیا اور وہاں سے لوٹا تو رات کے دس بج گئے تھے ۔ لالہ مداری لال کو تشفی دے کر میں گوپا کے پاس آیا میرے پاؤں کانپ رہے تھے ۔معلوم نہیں گوپا کی کیا حالت ہوگی ۔اس سے زیادہ دلشکن حادثہ اس کے لئے کیا ہو سکتا تھا سُنی اُسکی جان تھی ۔اس کا ارمان تھی سُنی ہی اس کی حیات کا منزلِ مقصود تھی ۔ اس کے اجڑے ہوئے گلزار میں یہی ایک پودا بچ رہا تھا ۔اسی کو وہ خونِ جگر سے سینچتی تھی ۔ اس کی بہار کے سنہرے خواب ہی اس کی زندگی تھی ۔ اس میں کونپلیں نکلیں گی ۔پھول کھلیں گے ۔پھل لگیں گے ۔چڑیاں اس کی شاخوں پر بیٹھ کر میٹھے نغمے گائیں گی لیکن آج انقلاب کے ظالم ہاتھوں نے اس پودے کو اُکھاڑ کر پھینک دیا اور اب اس کی زندگی میں کوئی مدار نہ تھا ۔ وہ مرکز ہی غائب ہو گیا تھا ۔جس پر زندگی کے سارے خطوط جمع ہوتے تھے ۔

دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے میں نے زنجیر کھٹکھٹائی ۔ گوپا نکلی اس کے ہاتھ میں ایک لالٹین تھی ۔اس کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ گوپا کے چہرے پر ایک نئی مسرت جھلک رہی تھی ۔میری غمناک صورت دیکھ کر اس نے مادرانہ الفت

سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولی :۔ آج تو تمہیں سارا دن ہی رو کے کٹا۔ جنازہ کے ساتھ
بہت سے آدمی ہوں گے میرے جی میں آیا کہ چل کر ستی کا آخری دیدار کروں لیکن
میں نے سوچا کہ جب ستی نہ رہی تو اس کی لاش میں کیا رکھا ہے۔ نہ گئی :۔

میں حیرت سے گویا کا منہ تکنے لگا کہ اسے اس سانحہ کی خبر مل چکی ہے پھر
بھی یہ سکون اور یہ اطمینان ! بولا :" اچھا کیا نہ گئیں۔ رونا ہی تو تھا :"

" ہاں اور کیا۔ روئی تو یہاں بھی لیکن تم سے سچ کہتی ہوں دل سے نہیں روئی
نہ جانے کیسے آنسو نکل آئے۔ مجھے تو اس کی موت سن کر خوشی ہوئی۔ دکھیا اپنی
عزت آبرو سے دنیا سے رخصت ہو گئی۔ نہیں تو جانے کیا کیا مصیبتیں جھیلنی پڑتیں۔
اس خیال سے خوش ہوں کہ اس نے اپنی آن نباہ دی ! عورت کی زندگی میں
پیار اور عزت نہ ملے تو اس کا ختم ہو جانا ہی اچھا۔ تم نے ستی کا چہرہ دیکھا تھا۔
لوگ کہتے ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ میری ستی سچ مچ دیوی تھی۔
آدمی اس لئے تھوڑا ہی جینا چاہتا ہے کہ روتا رہے۔ جب معلوم ہو گیا کہ زندگی
میں دکھ کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو آدمی جی کر کیا کرے۔ یہ میں نہیں کہتی کہ مجھے
ستی کی یاد نہ آئے گی۔ اور میں اسے یاد کر کے روؤں گی نہیں لیکن وہ رنج کے
آنسو نہ ہوں گے۔ خوشی کے آنسو ہوں گے۔

" بہادر بیٹے کی ماں اس کی بہادری پر خوش ہوتی ہے۔ ستی نے کچھ کم بہادری
کی ہے۔ سوچو ! میں آنسو بہا کر اس کی روح کو صدمہ پہنچاؤں ! رات زیادہ
ہو گئی ہے۔ جا کر اوپر سو رہو۔ میں نے تمہاری چارپائی بچھا دی ہے۔ مگر دیکھو
اکیلے پڑے پڑے رونا نہیں، ستی نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا۔

میں اوپر جا کر لیٹا تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ مگر رہ رہ کر دل میں
یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ گویا کا یہ سکونِ قلب ہے یا شدتِ درد !

ریاست کا دیوان

مسٹر مہتہ ان بدنصیبوں میں تھے جو اپنے آقا کو خوش نہیں رکھ سکتے۔ وہ دل سے اپنا کام کرتے تھے۔ بڑی یکسوئی اور ذمہ داری کے ساتھ! اور یہ بھول جاتے تھے کہ وہ کام کے نوکر تو ہیں ہی، اپنے آقا کے نوکر بھی ہیں جب ان کے دوسرے بھائی دربار میں بیٹھے خوش گپیاں کرتے تھے، دفتر میں بیٹھے کاغذ لیے سر مارتے اور اس کا نتیجہ تھا کہ جو آقا پرور تھے ان کی ترقیاں ہوتی تھیں۔ انعام و اکرام پاتے تھے اور یہ حضرت جو فرض پرور تھے، راندہ درگاہ سمجھے جاتے تھے اور کسی نہ کسی الزام میں نکال دیئے جاتے تھے۔ زندگی میں ایسے تلخ تجربے انہیں کئی بار ہوئے تھے۔ اس لیے جب اب کی [illegible] صاحب سیتا نے انہیں اپنے ہاں ایک معزز عہدہ

دے دیا تو انہوں نے عہد کر لیا کہ اب میں بھی آقا کا رُخ دیکھ کر کام کروں گا۔ اور ان کی مزاج داری کو اپنا شعار بناؤں گا۔ لگن کے ساتھ کام کرنے کا پھل پا چکا اب ایسی غلطی نہ کروں گا۔

دو سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ راجہ صاحب نے انہیں اپنا دیوان بنا لیا۔ ایک مختار ریاست کی دیوانی کا کیا کہنا۔ تنخواہ تو بہت کم تھی مگر اختیارات غیر محدود۔ راجہ صاحب اپنے سیر و شکار اور عیش و نشاط میں مصروف رہتے تھے۔ ساری ذمّہ داری مسٹر مہتہ پر تھی۔ ریاست کے حکّام ان کے سامنے سرِ نیاز خم کرتے۔ رؤسا نذرانے دیتے۔ تجار سجدے بجا لاتے۔ یہاں تک کہ رانیاں بھی ان کی خوشامد کرتی تھیں۔ راجہ صاحب بھی بد مزاج آدمی تھے۔ اور بد زبان بھی۔ کبھی کبھی سخت سُست کہہ بیٹھتے۔ مگر مسٹر مہتہ نے اپنا وطیرہ بنا لیا تھا کہ صفائی یا عذر میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالتے سب کچھ سر جھکا کر سُن لیتے۔ راجہ صاحب کا غصّہ فرد ہو جاتا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ پولٹیکل ایجنٹ کا دورہ تھا۔ ریاست میں ان کے خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راجہ صاحب نے مسٹر مہتہ کو بلا کر کہا "میں چاہتا ہوں کہ صاحب بہادر یہاں سے میرا کلمہ پڑھتے ہوئے جائیں"۔

مہتہ نے سر اٹھا کر کہا "کوشش تو ایسی ہی کر رہا ہوں اَن داتا"۔

"میں کوشش نہیں چاہتا۔ جس میں ناکامی کا پہلو بھی شامل ہے قطعی وعدہ چاہتا ہوں"۔

"ایسا ہی ہوگا"۔

"روپیہ کی پرواہ مت کیجیے"۔

"جو حکم"۔

"کسی کی فریاد یا شکایت پر کان نہ دیجیے"۔

"جو حکم۔"

"ریاست میں جو چیز ہے وہ ریاست کی ہے۔ آپ اس کا بے دریغ استعمال کر سکتے ہیں۔"

"جو حکم۔"

۴

ادھر تو پولیٹیکل ایجنٹ کی آمد تھی۔ ادھر مسٹر مہتہ کا لڑکا جے کرشن گرمیوں کی تعطیل میں گھر آیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ ایک بار ۱۹۳۲ء میں کوئی تقریر کرنے کے جرم میں چھ مہینے جیل ہو آیا تھا۔ اور تب سے کسی قدر خودسر ہو گیا تھا۔ مسٹر مہتہ کے تقرر کے بعد جب وہ ریاست میں پہلی بار آیا تھا تو راجہ صاحب نے بڑی بے تکلفی سے باتیں کی تھیں۔ اسے اپنے ساتھ شکار کھیلنے کے لئے لے گئے تھے اور روزانہ اس کے ساتھ کھیلتے تھے۔ جے کرشن راجہ صاحب کے قوم پرورانہ خیالات سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ راجہ صاحب سچے محب وطن ہی نہیں انقلاب کے حامیوں میں سے ہیں۔ روس اور فرانس کے انقلاب میں دونوں میں خوب مباحثے ہوئے لیکن اب کی یہاں اس نے کچھ اور ہی رنگ دیکھا۔ علاقہ کے ہر ایک کاشتکار اور زمیندار سے اس تقریب کے لئے جبراً چندہ وصول کیا جا رہا تھا۔ رقم کا تعین دیوان صاحب کرتے۔ وصول کرنا پولیس کا کام تھا۔ فریاد اور احتجاج کی مطلق شنوائی نہ ہوتی تھی۔ ہزاروں مزدور سرکاری عمارتوں کی صفائی سجاوٹ اور سڑکوں کی مرمت میں بیگار دے رہے تھے۔ بنیوں سے رسد جمع کی جا رہی تھی۔ ساری ریاست میں واویلا مچا ہوا تھا۔ جے کرشن کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ راجہ صاحب کے مزاج میں اتنا تغیر کیسے ہو گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ راجہ

صاحب کو ان زبردستیوں کی خبر نہ ہو اور انہوں نے جن تیاریوں کا حکم دیا ہو اس کی تعمیل میں کارپردازوں کی جانب سے اس سرگرمی کا اظہار کیا جا رہا ہو۔ رات بھر تو اس نے ضبط کیا اور دوسرے دن صبح ہی اس نے دیوان صاحب سے پوچھا "آپ نے راجہ صاحب کو ان زیادتیوں کی اطلاع نہیں دی ؟"

مسٹر مہتہ رعایا پرور آدمی تھے انہیں خود ان بے عنوانیوں سے کوفت ہو رہی تھی۔ مگر حالات سے مجبور تھے۔ بے کسانہ انداز سے بولے "راجہ صاحب کا یہی حکم ہو تو کیا کیا جائے ؟"

"تو آپ کو ایسی حالت میں کنارہ کش ہو جانا چاہئے تھا۔ آپ جانتے ہیں یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری آپ کے اوپر عائد ہو رہی ہے۔ رعایا آپ ہی کو مجرم سمجھتی ہے"

"میں مجبور ہوں۔ میں نے اہلکاروں سے بار بار کہا ہے کہ ضرورت سے زیادہ سختی نہ کی جائے لیکن ہر ایک موقعہ پر میں موجود تو نہیں رہ سکتا۔ اگر زیادہ مداخلت کروں تو شاید اہلکار میری شکایت راجہ صاحب سے کر دیں اہلکار ایسے ہی موقعوں کے منتظر رہتے ہیں۔ انہیں تو عوام کے لوٹنے کا کوئی بہانہ چاہئے جتنا سرکاری خزانہ میں داخل کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ اپنے گھر میں رکھ لیتے ہیں میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

جے کرشن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا "تو آپ استعفیٰ کیوں نہیں دے دیتے"

مسٹر مہتہ ہمدردانہ لہجہ میں بولے "بے شک۔ میرے لئے مناسب تو یہی تھا مگر زندگی میں اتنے دھکے کھا چکا ہوں کہ اب برداشت کی طاقت نہیں رہی۔ میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ ملازمت کر کے میں اپنے ضمیر کو بے داغ نہیں رکھ سکتا نیک نیت اور فرض اور ایمانداری کے جھمیلوں میں پڑ کر میں نے بہت سے تلخ تجربات حاصل

گئے۔ میں نے دیکھا کہ دنیا، دنیا داروں کے لئے ہے جو موقعہ محل دیکھ کر کام کرتے ہیں۔ اصول پرستوں کے لئے دنیا مناسب جگہ نہیں ہے۔

جے کرشن نے پوچھا "میں راجہ صاحب کے پاس جاؤں؟"

پنڈت نے اس سوال کا جواب نہ دے کر پوچھا "کیا تمہارا خیال ہے کہ راجہ صاحب کو ان واقعات کا علم نہیں ہے؟"

"کم سے کم آن پر حقیقت تو روشن ہو جائے گی۔"

"مجھے خوف ہے تمہارے منہ سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکل جائے جو مہاراج کی ناراضگی کا باعث ہو۔"

جے کرشن نے انہیں یقین دلایا کہ اس کی جانب سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوگی۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ آج کے مہاراج صاحب وہ نہیں ہیں جو ایک سال قبل تھے۔ ممکن ہے پولیٹیکل ایجنٹ کے رخصت ہو جانے کے بعد ہو جائیں ان کے لئے آزادی اور انقلاب کی گفتگو بھی اسی طرح تفریح کا باعث تھی جیسے قتل اور ڈاکہ کی وارداتیں، یا بازار حسن کی دلآویز خبریں۔ اس لئے جب اس نے مہاراج کی خدمت میں اطلاع کرائی تو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت اس وقت ناساز ہے لیکن وہ لوٹ ہی رہا تھا کہ مہاراج کو خیال آیا شاید اس سے فلمی دنیا کی تازہ ترین خبریں معلوم ہو جائیں۔ اسے بلا لیا اور مسکرا کر بولے "تم خوب آئے بھئی۔ کہو تم نے ایم سی سی کا میچ دیکھا یا نہیں؟ میں تو ان پریشانیوں میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ ہل نہ سکا۔ اب تو یہی دعا کر رہا ہوں کہ کسی طرح ایجنٹ صاحب خوش خوش رخصت ہو جائیں۔ میں نے جو تقریر تیار کرائی ہے وہ ذرا تم بھی دیکھ لو میں نے ان قومی تحریکوں کی خوب خبر لی ہے اور ہر ایک تحریک کے بھی چھیتڑے اڑا دئیے ہیں۔"

جے کرشن نے اعتراض کیا "لیکن ہریجن تحریک سے سرکار کو بھی اتفاق ہے۔ اسی لئے اس نے مہاتما جی کو رہا کر دیا۔ اور جیل میں بھی انہیں اس تحریک کے متعلق لکھنے پڑھنے کی کامل آزادی دے رکھی تھی۔"

راجہ صاحب نے عازماً تبسّم کے ساتھ کہا "تم ان رموز سے واقف نہیں معلوم ہوتے۔ یہ بھی سرکار کی ایک مصلحت ہے۔ دل میں گورنمنٹ خوب سمجھتی ہے کہ بالآخر یہ تحریک بھی قوم میں ہیجان پیدا کرے گی۔ اور ایسی تحریکوں سے اسے فطرتاً کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ سرکار اس کیفیت کو بڑے غور سے دیکھ رہی ہے۔ الٹی میں جتنی سرگرمی کا اظہار کرو، چاہے وہ حماقت کے درجہ تک ہی کیوں نہ پہنچ جائے۔ سرکار کبھی برا نہ مانے گی۔ اسی طرح جیسے شعراء کی مبالغہ آمیز مدح سرائیاں ہماری خوشی کا باعث ہوتی ہیں، چاہے ان میں تضحیک کا پہلو کیوں نہ ہو۔ ہم ایسے شاعر کو خوشامدی سمجھیں، احمق بھی سمجھ سکتے ہیں مگر اس سے ناراض نہیں ہو سکتے۔ وہ جتنا ہی مبالغہ کرے اتنا ہی ہمارے قریب آجاتا ہے۔"

راجہ صاحب نے اپنے خطبہ کی ایک خوبصورت کاپی میز کی دراز سے نکال کر جے کرشن کے ہاتھ میں رکھ دی۔ مگر جے کرشن کے لئے اب اس تقریر میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر وہ موقعہ شناس ہوتا تو ظاہر داری کے لئے ہی اس تقریر کو بڑے غور سے دیکھتا۔ اس کی عبارت آرائیوں کی داد دیتا۔ اس کا موازنہ مہاراجہ صاحب بیکانیر یا پٹیالہ کی تقریروں سے کرتا۔ مگر ابھی وہ اس کوچہ سے ناآشنا تھا۔ جس چیز کو برا سمجھتا تھا اسے برا کہتا تھا۔ جس چیز کو اچھا اسے اچھا۔ برے کو اچھا اور اچھے کو برا کہنا ابھی اسے نہ آیا تھا۔ اس نے تقریر پر سرسری نظر ڈالی اور میز پر رکھ دیا۔ اور

اپنی آزادروی کا بگل بجاتا ہوا بولا "

میں ان عقیدوں کو کیا سمجھوں گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ حکّام پکّے نبض شناس ہوتے ہیں۔ اور تصنّع سے مطلق متاثر نہیں ہوتے بلکہ اس سے انسان انکی نظروں میں اور بھی گر جاتا ہے۔ اگر پولیٹیکل ایجنٹ کو معلوم ہو جائے کہ اس خیر مقدم کے لئے رعایا پر کتنے ستم کئے جا رہے ہیں تو شاید وہ یہاں سے خوش ہو کر نہ جائے گا پھر ایجنٹ کی خوشنودی آپ کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے رعایا کو اس سے نقصان ہی ہوگا "

راجہ صاحب دیگر فرماں رواؤں کی طرح اپنے سے زیادہ طاقتوروں کے سامنے تو انکسار کے پتلے تھے لیکن کمزوروں کی جانب سے نکتہ چینی کی انہیں مطلق برداشت نہ تھی۔ ان کے غصّہ کی ابتدائی صورت جرح ہوتی تھی۔ پھر استدلال کا درجہ آتا تھا۔ جو فوراً تہدید کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ زلزلہ کی حرکتوں میں نمودار ہوتا۔ سُرخ ترچھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا نقصان ہوگا؟ ذرا سنوں "

جے کرشن سمجھ گیا کہ غصّہ کی مشین گن گردش میں آگئی۔ سنبھل کر بولا۔

" اسے آپ مجھ سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں "

" نہیں میں اتنا زود فہم نہیں ہوں "

" آپ برا مان جائیں گے "

"کیا تم سمجھتے ہو میں بارود کا ڈھیر ہوں؟"

" بہتر ہو اگر آپ مجھ سے یہ سوال نہ کریں "

" تمہیں بتانا پڑے گا " اور اضطراری طور پر اُن کی مٹھیاں بندھ گئیں۔

" فوراً اسی وقت "

جے کرشن پر رُعب کیوں طاری ہونے لگا۔ بولا "آپ بھی پولٹیکل ایجنٹ سے ڈرتے ہیں۔ جب وہ آپ کا ممنون ہو جائے گا۔ تب آپ مطلق العنان ہو جائیں گے اور رعایا کی فریاد سننے والا کوئی نہ رہے گا۔"

راجہ صاحب شعلہ بار آنکھوں سے تاکتے ہوئے بولے "میں ایجنٹ کا غلام نہیں ہوں کہ اس سے ڈروں۔ بالکل کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں ایجنٹ کی محض اس لئے خاطر کرتا ہوں کہ وہ شہنشاہ کا قائمقام ہے میرے اور شہنشاہ کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم ہیں۔ محض آئین سلطنت کی پابندی کر رہا ہوں۔ میں ولایت جاؤں تو اسی طرح ہز میجسٹی بھی میری تواضع و تکریم کریں گے میں ڈروں کیوں؟ میں اپنی ریاست کا خود مختار راجہ ہوں۔ جسے چاہوں پھانسی دے سکتا ہوں۔ میں کسی سے کیوں ڈرنے لگا۔ ڈر نامردوں کا کام ہے۔ میں خدا سے بھی نہیں ڈرتا۔ ڈر کیا چیز ہے۔ یہ میں آج تک نہ جان سکا میں تمہاری طرح غیر ذمہ دار کالج کا طالب علم نہیں ہوں کہ انقلاب اور آزادی کی صدا لگاتا پھروں۔ حالانکہ تم نے ان چیزوں کا محض ابھی نام سنا ہے۔ اس کے خونی مناظر آنکھوں سے نہیں دیکھے۔ تم خوش ہو گے اگر میں ایجنٹ سے پنجہ آزمائی کروں۔ میں اتنا احمق نہیں ہوں، میں اندھا نہیں ہوں، رعایا کی حالت کا مجھے تم سے کہیں زیادہ علم ہے۔ میں شادی و غم میں ان کا شریک اور ہمدرد رہا ہوں۔ ان سے جو محبت مجھے ہو سکتی ہے وہ تمہیں کبھی نہیں ہو سکتی۔ تم میری رعایا کو انقلاب کے خواب دکھا کر گمراہ نہیں کر سکتے۔ تم میری ریاست میں فساد کے بیج نہیں بو سکتے۔ تمہیں اپنی زبان پر خموشی کی مہر لگانی ہو گی۔"

آفتاب مغرب میں ڈوب رہا تھا اور اس کی کرنیں محراب کے رنگین شیشوں سے گذر کر راجہ کے چہرہ کو اور غضبناک بنا رہی تھیں۔ ان کے بال نیلے ہو گئے تھے۔

آنکھیں زرد تھیں۔ چہرہ سرخ اور جسم سبز ہوگیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی دوسری دنیا کی ہیبت ناک مخلوق ہے۔ جے کرشن کی ساری انقلاب پسندی غائب ہوگئی۔ راجہ صاحب کو اتنے طیش میں اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا مردانہ وقار اس للکار کا جواب دینے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ جیسے حلم کا جواب حلم ہے ویسے ہی غصہ کا جواب غصہ ہے۔ جب وہ رُعب، خوف، لحاظ اور ادب کی بندشوں کو توڑ کر بدمست ہو کر باہر نکلتا ہے پھر چاہے وہ اس بدمستی میں سرنگوں ہی کیوں نہ ہو جائے، اس نے بھی راجہ صاحب کو مجروح نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"میں اپنی آنکھوں سے یہ ظلم و ستم دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا۔"

راجہ صاحب نے دانت پیس کر کہا "تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"ہر ذی ہوش انسان کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق ہے۔ آپ مجھے اس سے محروم نہیں کرسکتے۔"

"میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔ میں تمہیں ابھی جیل میں بند کرسکتا ہوں۔"

"آپ کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ میں آپ کی رعایا نہیں ہوں۔"

اسی وقت مسٹر مہتہ نے ایک دہشت کے عالم میں کمرے میں قدم رکھا اور جے کرشن کی طرف قہر کی آنکھوں سے دیکھ کر بولے "کرشنا نکل جا یہاں سے، ناخلف تجھے خبر ہے تو کس سے زبان درازی کر رہا ہے۔ ابھی میری نظروں سے دور ہو جا۔ احسان فراموش کہیں کا۔ جس تھالی میں کھاتا ہے اسی میں سوراخ کرتا ہے۔ دیوانہ! اگر اب زبان کھولی تو میں تیرا خون پی جاؤں گا۔"

جے کرشن ایک لمحہ تک مہتہ کے غضب ناک چہرے کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور تب فاتحانہ غرور سے اکڑتا ہوا دیوان خانہ سے نکل گیا۔

راجہ صاحب نے کوچ پر لیٹ کر کہا "مسٹر مہتہ یہ انتہا درجہ کا مفسد

میں نہیں چاہتا ایسا خطرناک آدمی میری ریاست میں ایک لمحہ بھی رہے۔ تم اس سے جاکر کہہ دو کہ اسی وقت یہاں سے چلا جائے ورنہ اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ میں خود سر کی گوشمالی کرنا جانتا ہوں۔ میں محض آپ کی مروت سے اتنا تحمل کر گیا ورنہ اسی وقت اس کی فتنہ انگیزیوں کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ آپ کو اسی وقت فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہاں رہنا ہے یا نہیں اگر رہنا منظور ہے تو طلوع سحر کے قبل اسے میرے قلمرو سے باہر نکل جانا چاہیئے۔ ورنہ آپ حراست میں ہوں گے اور آپ کا سارا مال و اسباب ضبط کر لیا جائے گا۔"

مسٹر مہتہ نے خطا وارانہ انداز سے کہا۔ "آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا۔"

راجہ صاحب نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "آج نہیں، اسی وقت۔"

مہتہ نے ذلت کو نگل کر جواب دیا۔ "اسی وقت نکال دوں گا۔"

راجہ صاحب بولے "اچھی بات ہے۔ تشریف لے جایئے۔ اور آدھ گھنٹہ کے اندر آکر مجھے اطلاع دیجیئے۔"

مسٹر مہتہ گھر چلے تو انہیں جے کرشن پر بے انتہا طیش آرہا تھا۔ احمق چلا ہے یہاں آزادی کا راگ الاپنے۔ اب بچہ کو معلوم ہوگا یہ راجے کس آب و گل کے بنے ہوتے ہیں۔ میں اس کے پیچھے دنیا میں رسوا و ذلیل نہیں ہو سکتا۔ وہ خود اپنے فعل کا خمیازہ اٹھائے۔ یہ بے عنوانیاں مجھے بری لگتی ہیں جب کسی بات کا علاج میرے امکان میں نہیں تو اسی ایک معاملہ کے پیچھے کیوں اپنی زندگی خراب کروں۔"

گھر میں قدم رکھتے ہی انہوں نے کرخت لہجہ میں پکارا "جے کرشن۔"

جے کرشن ابھی تک گھر نہ آیا تھا۔ سنیتا نے کہا۔ "وہ تو تم سے پہلے ہی راجہ صاحب سے ملنے گیا تھا تب سے کب آیا۔ بیٹھا گپ شپ کر رہا ہوگا۔"

اسی وقت ایک سپاہی نے ایک رقعہ لاکر ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مہتہ نے پڑھا
"اس ذلت کے بعد میں اس ریاست میں ایک لمحہ بھی رہنا گوارا نہیں کر سکتا میں جانتا ہوں۔ آپ کو اپنا عہدہ اور اعزاز اپنے ضمیر سے زیادہ عزیز ہے آپ شوق سے رہیں۔ میں پھر اس ریاست میں قدم نہ رکھوں گا۔ اماں جی سے میرا پرنام کہئے گا"

مسٹر مہتہ نے پرزہ بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور مایوسانہ انداز سے بولے "اس لونڈے کو نہ جانے کب عقل آئے گی۔ جاکر مہاراجہ صاحب سے الجھ پڑا۔ وہ تو یہ کہو میں پہنچ گیا ورنہ راجہ صاحب اسی وقت اسے حراست میں لے لیتے۔ یہ خود مختار راجے ہیں۔ انہیں کس کا خوف۔ انگریزی سرکار بھی تو انہیں کی سنتی ہے۔ مگر بہت اچھا ہوا بچہ کو سبق مل گیا۔ اب معلوم ہو گیا ہوگا دنیا میں کس طرح رہنا چاہئے اور اپنے جذبات پر قابو نہ رکھنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے میں یہ تماشے بہت دیکھ چکا اور ان خرافات کے پیچھے اپنی زندگی نہیں برباد کرنا چاہتا"
اور اسی وقت وہ راجہ صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع دینے چلے۔

۳

ایک لمحہ میں ساری ریاست میں یہ خبر مشہور ہو گئی۔ جے کرشن اپنی غریب دوستی کے باعث عوام میں بہت مقبول تھا۔ لوگ بازاروں میں اور چورستوں پر کھڑے ہو کر اس واقعہ پر رائے زنی کرنے لگے "اجی وہ آدمی نہیں تھا بھائی کوئی دیوتا کا اوتار سمجھو اسے۔ مہاراجہ صاحب سے جاکر بولا۔ ابھی بیگار بند کیجئے ورنہ شہر میں آفت آجائے گی۔ راجہ صاحب کی تو اس کے سامنے زبان بند ہو گئی۔ صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔ شیر ہے شیر۔ اور وہ بیگار بند کرا کے رہتا۔ راجہ صاحب کو

بھاگنے کی راہ نہ ملتی بھُنناہٹ گھگھیانے لگے تھے ۔ ٹھاکر سی بیچ میں دیوان صاحب نے جاکر اس کے دیس نکالے کا حکم دیدیا۔ یہ حکم سن کر اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ لیکن باپ کی بے عزتی کیسے کرتا۔"

" ایسے باپ کو تو گولی ماردینی چاہئے ۔ یہ باپ ہے یا دشمن ؟"

" وہ کچھ بھی ہے، ہے تو باپ ہی ۔"

جے کرشن کی ماں کا نام سُنیتا تھا بیٹے کی جلاوطنی اس کے جگر میں برچھیاں چبھونے لگی ۔ ابھی تو اس سے جی کھول کر باتیں بھی نہ کرنے پائی تھی سوچا تھا اس سال بیاہ رچائیں گے ۔ چنچی منی بہو گھر میں آئے گی ۔ ادھر یہ بجلی گر پڑی ۔ نہ جانے بے چارا کہاں گیا ۔ رات کو کہاں رہے گا ۔ اس کے پاس روپے بھی تو نہیں غریب پاؤں پاؤں بھاگا چلا جاتا ہوگا ۔ دل میں ایسا طوفان اُٹھا کہ گھر اور شہر چھوڑ کر ریاست سے نکل جائے انہیں اپنا عہدہ پیارا ہے ۔ لے کر رہیں ۔ وہ اپنے لختِ جگر کے ساتھ فاقے کرے گی اسے آنکھوں سے دیکھتی رہے گی لیکن نہیں وہ جاکر فریاد کرے گی ۔ انہیں بھی ایشور نے بچے دئے ہیں ماں کا درد ماں ہی سمجھ سکتی ہے ۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار مہارانی کے قدمبوس ہو چکی تھی ۔ فوراً سواری منگوائی اور مہارانی کے پاس جا پہنچی ۔

مہارانی کے تیور آج بدلے ہوئے تھے ۔ منہ لٹکا ہوا تھا ۔ راجہ صاحب کے اقلیم دل پر تو ان کا راج نہ تھا مگر وہ ولی عہد کی ماں تھیں ۔ اور یہ غرور انہیں مہاراجہ سے بے نیاز رکھنے کے لئے کافی تھا ۔ بولیں " بہن ! تمہارا لڑکا بڑا بدزبان ہے ۔ ذرا بھی ادب نہیں کس سے کس طرح بات چیت کرنی چاہئے ۔ اس کا اسے ذرا بھی سلیقہ نہیں ۔ مہاراج نے پہلی بار ذرا اُسے منہ لگایا تو اس کی سر چڑھ گیا ۔ کہنے لگا بیگار بند کر دیجئے ۔ اور ایجنٹ صاحب کے استقبال اور نیاز ماری کی کوئی تیاری

نہ کیجئے۔ اتنا سمجھاتے نہیں ہے کہ اس طرح ہیکڑی جتا کر ہم کے گھنٹے گدی پر رہ سکتے ہیں۔ پھر یہ خیال بھی تو ہونا چاہئے کہ ایجنٹ کا رتبہ کیا ہے۔ ایجنٹ بادشاہ سلامت کا قائم مقام ہے۔ اس کی خاطر تواضع کرنا ہمارا فرض ہے۔ یہ بیگار آخر کس دن کام آئیں گے۔ اسی موقعہ کے لئے ریاست سے ان کو جاگیریں مقرر ہیں۔ رعایا میں ایسی بغاوت پھیلانا کوئی بھلے آدمی کا کام ہے۔ جس تھالی میں کھاؤ اسی میں سوراخ کرو۔ مہاراجہ صاحب نے دیوان صاحب کا لحاظ کیا ورنہ اسی وقت اسے حراست میں ڈال دیتے۔ وہ اب کوئی بچہ نہیں ہے خاصا جوان ہے۔ سب کچھ دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ سو جو حاکموں سے بیر کریں تو کے دن بھلا نباہ ہو۔ اس کا کیا بگڑتا ہے کہیں سو پچاس کی نوکری پا ہی جائے گا۔ یہاں تو ریاست تباہ ہو جائے گی۔"

سجاتا نے آنچل پھیلا کر کہا: "مہارانی بجا فرماتی ہیں۔ مگر اب تو اس کی خطا معاف کیجئے۔ بے چارہ شرم اور خوف سے گھر نہیں گیا۔ نہ جانے کدھر نکل گیا۔ ہماری زندگی کا یہی ایک سہارا ہے۔ مہارانی! ہم دونوں رو رو کر مر جائیں گے۔ آنچل پھیلا کر آپ سے بھیک مانگتی ہوں۔ اس کی خطا معاف کیجئے۔ ماں کے درد کو آپ سے زیادہ کون سمجھے گا۔ آپ ہی میرے رنج کا اندازہ کر سکتی ہوں۔ آپ مہاراج سے سفارش کر دیں تو..."

مہارانی نے بات کاٹ کر کہا: "کیا کہتی ہو سجاتا دیوی، مہاراج سے اس کی سفارش کروں! آستین میں سانپ پالوں۔ تم کس منہ سے مجھ سے ایسی درخواست کرتی ہو۔ اور مہاراج مجھے کیا کہیں گے۔ میں تو اپنے لڑکے کا منہ نہ دیکھتی اور تم ایسے کپوت بیٹے کی سفارش لے کر آئی ہو۔"

"ایک بدنصیب ماں آیا مہارانی کے دربار سے مایوس ہو کر جائے گی؟"

یہ کہتے کہتے سجاتا کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ مہارانی کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا مگر وہ مہاراج کے مزاج سے واقف تھیں۔ اس وقت وہ کوئی سفارش نہ سنیں گے اس لئے مہارانی کوئی وعدہ کرکے شرمندگی کی ذلت نہ اٹھانا چاہتی تھیں۔

"میں کچھ نہیں کرسکتی سجاتا دیوی"۔

"سفارش کا ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکال سکتیں؟"

"میں مجبور ہوں"۔

سجاتا آنکھوں میں غصہ کے آنسو لاکر بولی "اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں مظلوموں کے لئے فریاد کی کوئی جگہ نہیں ہے"۔

مہارانی کو رحم دیر میں آتا تھا۔ غصہ ناک پر رہتا تھا۔ گرم ہوکر بولیں۔ اگر تم نے سوچا تھا کہ میں تمہارے آنسو پونچھوں گی تو تم نے غلطی کی تھی۔ جو قاتل ہماری جان لینے پر آمادہ ہو اس کی سفارش لے کر آنا اس کے سوا اور کیا کہنا ہے کہ تم اس جرم کو خفیف سمجھتی ہو۔ اگر تم نے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا ہوتا تو ہرگز میرے پاس نہ آتیں۔ جس نے ریاست کا نمک کھایا ہے وہ ریاست کے ایک بدخواہ سے ہمدردی کرے یہ خود بہت بڑا جرم ہے"۔

سجاتا بھی گرم ہوئی۔ جذبہ مادری مصلحت پر غالب آگیا۔ بولی "راجہ کا کام محض اپنے حکام کو خوش کرنا نہیں ہے، رعایا پروری کی ذمہ داری بھی اس کے سر ہے۔ اور یہ اس کا مقدم فرض ہے"۔

اسی وقت مہاراج نے کمرہ میں قدم رکھا۔ رانی نے اُٹھ کر ان کی تعظیم دی۔ اور سجاتا گھونگھٹ نکال کر سر جھکائے دم بخود کھڑی رہ گئی۔ کہیں مہاراجہ صاحب نے تو اس کی بات نہیں سُن لی۔

راجہ نے پوچھا "یہ کون عورت تمہیں راجوں کے فرائض کی تعلیم دے رہی تھی"۔

رانی نے کہا "یہ دیوان صاحب کی بیوی ہیں"۔

راجہ نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا "جب ماں ایسی زبان دراز ہے تو لڑکا کیوں نہ گستاخ اور باغی ہو۔ دیوی جی میں تم سے یہ تعلیم نہیں لینا چاہتا کہ راجہ کے اپنی رعایا کے ساتھ کیا فرائض ہیں۔ مجھے یہ تعلیم کئی پشتوں سے ملتی چلی آئی ہے۔ بہتر ہو کہ تم کسی سے یہ تعلیم حاصل کر لو کہ آقا کی جانب اس کے نمک خواروں کے کیا فرائض ہیں۔ اور جو نمک حرام ہیں ان کے سامنے اسے کیسا برتاؤ کرنا چاہئے"۔

راجہ صاحب طیش کے عالم میں باہر چلے گئے۔ مسٹر مہتہ جا ہی رہے تھے کہ راجہ صاحب نے تند لہجہ میں پکارا "سنئے مسٹر مہتہ۔ آپ کے صاحبزادے تو رخصت ہو گئے لیکن مجھے ابھی معلوم ہوا کہ غداری کے میدان میں آپ کی دیوی جی ان سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ وہ محض ریکارڈ ہے جس میں دیوی جی کی آواز بول رہی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جو شخص ریاست کی ذمہ داریوں کا مرکز ہے۔ اس کے سائے میں ریاست کے ایسے بدخواہوں کو پناہ ملے۔ آپ خود اس ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتے۔ یہ ہرگز میری بے انصافی نہ ہو گی۔ اگر میں خیال کروں کہ آپ کی چشم پوشی نے ہی یہ حالات پیدا کئے ہیں۔ میں یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ نے صریحاً نہیں تو کنایۃً ضرور ان خیالات کی تحریک کی ہے"۔

مسٹر مہتہ اپنی ذمہ داری اور آقا پروری پر یہ حملہ برداشت نہ کر سکے۔ فوراً مردانہ تردید کی "میں کس زبان سے کہوں کہ اس معاملہ میں حضور بے انصافی کر رہے ہیں لیکن میں بے قصور ہوں۔ اور مجھے یہ دیکھ کر ملال ہوتا ہے کہ میری وفاداری پر یوں شبہہ کیا جائے"۔

مہاراج نے تحکمانہ لہجہ میں کہا "اس کے لئے ثبوت کی ضرورت ہے دیوان صاحب!"

"کیا ابھی ثبوت کی ضرورت ہے؟ میرا خیال ہے میں ثبوت دے چکا۔"

"نہیں۔ نئے انکشافات کے لئے نئے ثبوت کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ اپنی دیوی جی کو ہمیشہ کے لئے ریاست سے رخصت کر دیں۔ میں اس میں کسی طرح کا عذر سننا نہیں چاہتا۔"

"لیکن مہاراج ....."

"میں ایک حرف نہیں سننا چاہتا۔"

"میں کچھ عرض نہیں کر سکتا؟"

"ایک لفظ بھی نہیں۔"

مسٹر مہتہ یہاں سے چلے تو انہیں سجھاتا رہے حد غصہ آ رہا تھا۔ ان سب کے دماغ میں نہ جانے کیوں یہ خبط سما گیا ہے جسے کرشن تو خیر لڑکا ہے۔ آزمودہ کار اس بڑھیا کو کیا حماقت سوجھی۔ نہ جانے اس سے کیا کیا کہہ آئی۔ میرے ہی گھر میں کسی کو مجھ سے ہمدردی نہیں۔ سب اپنی اپنی دھن میں مست ہیں۔ کس مصیبت سے میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں۔ یہ کوئی نہیں سوچتا۔ کتنی پریشانیوں اور ناکامیوں کے بعد ذرا اطمینان سے سانس لینے پایا تھا کہ ان سب نے یہ نئی مصیبت کھڑی کر دی۔ حق اور انصاف کا ٹھیکہ کیا ہم نے لے لیا ہے۔ یہاں بھی وہی ہو رہا ہے جو ساری دنیا میں۔ غریب اور کمزور رہنا جرم ہے۔ اس کی سزا سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ باز کبوتر پر کبھی رحم نہیں کرتا۔ حق اور انصاف کی حمایت انسان کی شرافت کا ایک جزو ہے۔ بے شک اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن جس طرح اور سب لوگ صرف زبان سے اس کی حمایت کرتے ہیں۔ کیا اسی طرح ہم بھی نہیں کر سکتے۔ اور جن لوگوں کی حمایت کی جائے ان کی نگاہ میں کچھ اس حمایت کی قدر بھی تو ہو۔ آج راجہ صاحب انہیں مظلوم مزدوروں سے

ذرا ہلکی کر باتیں کریں تو یہ لوگ ساری [illegible] باتیں بھول جائیں۔ اور ہماری [illegible] کشی پر آمادہ ہو جائیں گے۔ جانا کی بھویں چڑھی ہوئی تھیں۔ ضرور اس نے کہا راؤ صاحب سے بدزبانی کی ہوگی۔ خوب اپنے دل کا غبار نکالا ہوگا۔ یہ دیکھیں کہ دنیا میں کس طرح عزت اور آبرو کے ساتھ بیٹھا جائے۔ اس کے سوا ہمیں اور کیا چاہیے۔ اگر تقدیر میں نیک نامی لکھی ہوتی تو اس طرح دوسروں کی غلامی کیوں کرتا، لیکن سوال یہ ہے کہ جانا کو سمجھاؤں کیسے؟ بچے بھی کوئی نہیں ہے۔ میرے گھر میں کوئی نہیں۔ اوہ۔ ایسی اس کی کہاں تک فکر کروں۔ جہاں جی چاہے جائے۔

وہ اسی غم و غصہ کی حالت میں گھر میں داخل ہوئے۔ جانا ابھی ابھی آئی تھی کہ چیتہ نے پہنچ کر دل شکن انداز سے کہا "آخر تمہیں بھی وہی حماقت سوجھی جو اس لونڈے کو سوجھی تھی۔ میں کہتا ہوں آخر تم لوگوں کو کبھی عقل آئے گی یا نہیں؟ کیا ساری دنیا کی اصلاح کا بیڑا ہم ہی نے اٹھا لیا ہے۔ کون راجہ ہے جو اپنی رعایا پر ظلم نہ کرتا ہو؟ ان کے حقوق نہ پامال کرتا ہو۔ راجہ ہی کیوں، ہم تم دوسروں کے حقوق پر دست درازی کر رہے ہیں۔ تمہیں کیا حق ہے کہ تم درجنوں خدمتگار رکھو اور انہیں ذرا ذرا سے قصور پر سزائیں دو۔ حق اور انصاف مہمل لفظ ہیں، جن کا مصرف اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ چند عقلمندوں کو شہرت کا موقع ملے۔ اور بہت سے احمقوں کو ذلت و رسوائی کا۔ تم مجھے اپنے ساتھ ڈبوئے دیتی ہو۔ حالانکہ میں تم سے بار ہا کہہ چکا ہوں، کہ میں اپنی زندگی میں [illegible] سے پرخاش نہ کروں گا۔ حق کی حمایت کر کے بجز [illegible] اور بیماری کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ میں صاف کہتا ہوں کہ [illegible] تمہاری حماقتوں کا خمیازہ اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

شہاتا نے خودداری کی شان سے کہا۔" میں یہاں سے چلی جاؤں یہی تو تمہارا منشا رہے ؟ میں بڑی خوشی سے جانے کو تیار ہوں۔ میں ایسے ظالم کی غمخواری میں پانی پینا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔"

" اس کے سوا مجھے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں پوشیدہ طور پر تمہارے اخراجات کے لئے روپے بھیجتا رہوں گا۔"

" نہیں۔ مجھے تمہارے روپیوں کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے روپے جمع کرنا اور بینک کا اکاؤنٹ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ کون جانے کہیں راز فاش ہو جائے تو آقائے نامدار کا قہر تمہارے اوپر نازل ہو جائے۔ میرا لڑکا اور کچھ نہ کر سکے گا تو شام تک ننک روٹی لے ہی آئے گا۔ میں اسی میں خوش ہوں گی۔ میں بھی دیکھوں گی کہ تمہاری آقا پروری کب تک نبھتی ہے۔ اور تم کہاں تک اپنے ضمیر کا خون کرتے ہو"

ہنت نے بھنّا کر کہا۔

" تم کیا چاہتی ہو کہ پھر اسی طرح چاروں طرف ٹھوکریں کھاتا پھروں؟"

سجاتا نے طنز کے ساتھ کہا:" ہرگز نہیں۔ اب تک میرا خیال تھا کہ عہدے اور روپے سے عزیز تر بھی تمہارے پاس کوئی چیز ہے جس کے لئے تم ٹھوکریں کھانا اچھا سمجھتے ہو۔ اب معلوم ہوا تمہیں عہدہ اور دولت اپنے ضمیر سے بھی زیادہ عزیز ہے پھر کیوں ٹھوکریں کھاؤ۔ کبھی کبھی اپنی خیریت کا خط بھیجتے رہنا۔ یا اس کے لئے بھی راجہ صاحب کی اجازت لینی پڑے گی ؟"

ہنت نے آقا پروری کے جوش کے ساتھ کہا۔" راجہ صاحب اتنے ظالم نہیں ہیں کہ میرے جائز حق میں دست اندازی کریں۔"

" اچھا، راجہ صاحب میں اتنی انسانیت ہے مجھے تو اعتبار نہیں آتا۔"

" تم نے کہاں جانے کا ارادہ کیا ہے ؟"

"جہنم میں!"

۴

جس وقت سجاتا گھر سے رخصت ہونے لگی تو میاں بیوی دونوں خوب بٹے اور ایک طرح سے سجاتا نے اپنی غلطی تسلیم کر لی کہ واقعی اس بیکاری کے زمانہ میں مہتہ کا یہی طرز عمل مناسب تھا۔ سچ مچ بے چارے کہاں کہاں مارے پھرتے۔

اس طرح شوہر سے علیحدہ ہونے سے اسے روحانی صدمہ ہو رہا تھا۔ اور اگر مہتہ نے جھوٹوں اصرار کیا ہوتا تو وہ گھر سے باہر پاؤں نہ نکالتی۔ مگر ادھر راجہ صاحب پل پل بھر بعد دریافت کر رہے تھے کہ دیوی جی گئیں یا نہیں؟ اور اب قدم پیچھے ہٹانے کے لئے کوئی بہانہ نہ تھا۔

پولیٹیکل ایجنٹ صاحب تشریف لائے۔ خوب دعوتیں کھائیں۔ خوب شکار کھیلے۔ اور خوب سیریں کیں۔ مہاراجہ صاحب نے ان کی تعریف کی انہوں نے مہاراجہ صاحب کی تعریف کی۔ اور ان کے انصاف اور رعایا پروری اور تنظیم کی خوب دل کھول کر داد دی۔ مسٹر مہتہ کی کارگزاری نے بھی تحسین کا خراج وصول کیا۔ ایسا وفاشعار اور کارگزار افسر اس ریاست میں کبھی نہ آیا تھا۔ ایجنٹ صاحب نے ایک گھڑی انہیں انعام دی۔

اب راجہ صاحب کو کم سے کم تین سال کے لئے فراغت تھی ایجنٹان سے خوش تھا۔ اب کس بات کا غم۔ اور کس کا خوف۔ عیاشی کا دور دورہ نئے سرے کے ساتھ شروع ہوا۔ نت نئے حسینوں کی بہم رسانی کے لئے خفیہ خبر رسانی کا ایک محکمہ قائم ہو گیا۔ اور اسے زنانہ تعلیم کا نام دیا گیا۔ نئی نئی چڑیاں آنے لگیں۔ کہیں تحویلیں کام کرتی تھیں۔ کہیں تحریصیں۔ اور کہیں تالیف۔ لیکن ایسا موقعہ بھی

آیا جب اس تثلیث کی ساری انفرادی اور اجتماعی کوششیں ناکام ہوئیں۔ اور خفیہ محکمہ نے فیصلہ کیا کہ اس نازنین کو اس کے گھر سے بہ جبر اٹھا لایا جائے اور اس خدمت کے لئے مہتہ صاحب کا انتخاب ہوا۔ جس سے زیادہ جان نثار خادم ریاست میں دوسرا نہ تھا۔ ان کی جانب سے مہاراجہ صاحب کو کامل اطمینان تھا کمتر درجہ کے اہلکار ممکن ہے رشوت لے کر شکار چھوڑ دیں۔ یا افشار راز کر بیٹھیں یا امانت میں خیانت کریں۔ مسٹر مہتہ کی جانب سے کسی قسم کی بے عنوانی کا اندیشہ نہ تھا ٹھیک نو بجے چوبدار نے ان کو اطلاع دی۔

"اُن داتا نے یاد کیا ہے"

مہتہ صاحب جب ڈیوڑھی پر پہنچے تو راجہ صاحب باغیچے میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ مہتہ کو دیکھتے ہی بولے۔

"آئیے مسٹر مہتہ! آپ سے ایک اہم معاملہ میں مشورہ لینا ہے۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ آپ کا مجسمہ اسی باغ کے وسط میں نصب کیا جائے جس سے آپ کی یادگار ہمیشہ قائم رہے۔ آپ کو تو غالباً اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا"

مہتہ نے بڑے انکسار کے ساتھ کہا "یہ اُن داتا کی غلام نوازی ہے۔ میں تو ایک ذرۂ ناچیز ہوں"

"میں نے لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ اس کے لئے چندہ جمع کریں۔ ایجنٹ صاحب نے اب کی جو خط لکھا ہے اس میں آپ کو خاص طور سے لکھا ہے"

"یہ اُن کی غریب پروری ہے۔ میں تو ادنیٰ خادم ہوں"

راجہ صاحب ایک لمحہ تک سر نگار بیٹھے رہے۔ تب اسی انداز سے بولے گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"تحصیل خاص میں ایک موضع جگن پور ہے۔ آپ وہاں کبھی گئے ہیں؟"

ہمنہ نے مستعدی سے جواب دیا: "ہاں ان داتا۔ ایک بار گیا ہوں جہاں ایک متمول ساہوکار ہے اسی کے دیوان خانہ میں ٹھہرا تھا۔ معقول آدمی ہے۔"

"ہاں ظاہر میں بہت اچھا آدمی ہے۔ مگر دل کا نہایت خبیث ہے۔ آپ کو معلوم ہے مہارانی صاحبہ کی صحت بہت خراب ہوتی جاتی ہے اور اب میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اپنی دوسری شادی کر لوں۔ راجاؤں کا یہ عام وطیرہ ہے کہ کسی نہ کسی حیلہ سے روز نئی شادیاں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے اس ہوس پرستی سے ہمیشہ احتراز کیا ہے اور اب تک بڑی تن دہی سے رانی صاحبہ کا علاج کراتا رہا۔ لیکن ان کی حالت روز بروز گرتی جاتی ہے۔ اور اب میں مجبور ہو گیا ہوں۔ ایک لڑکی بھی تجویز کر لی ہے۔ جو ہر اعتبار سے رانی بننے کے قابل ہے۔ وہ اسی ساہوکار کی لڑکی ہے۔ میں ایک بار ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے اسے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے دیکھا۔ مجھے معاً خیال آیا کہ اگر یہ حسینہ رنواس میں آجائے تو میری عمر دراز ہو جائے۔ میں نے خاندان کے آدمیوں سے اس بارے میں صلاح کی اور اس ساہوکار کے پاس پیغام بھیج دیا۔ مگر اسے مفسدوں نے کچھ ایسی پٹی پڑھائی ہے کہ وہ کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ کہتا ہے کہ لڑکی کی شادی ہو چکی ہے۔ مجھے جہاں تک معلوم ہے یہ اس کی بہانہ بازی ہے۔ لیکن بالفرض اس کی شادی بھی ہو چکی ہو، تو راجہ ہونے کی حیثیت سے میرا حق فائق ہے۔ اور پھر میں ہر قسم کا تاوان بھی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن وہ مفسد برابر انکار کئے جاتا ہے مجھے اس لڑکی کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ مجھے ایسا اندیشہ ہو رہا ہے کہ اگر ناکام رہا تو شاید جانبر نہ ہو سکوں۔ اندیشہ ہی نہیں یہ اس قسم کا یقینی امر ہے۔ آپ کو بھی شاید اس قسم کا تجربہ کبھی ہوا ہو۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ خواب حرام ہے۔ ہمیشہ اسی کی یاد میں محو رہتا ہوں۔ اور ایسی حالت میں

مجھے آپ کے سوا کوئی دوسرا ایسا آدمی نظر نہیں آتا۔ جو اس مسئلہ کو حل کر سکے آپ جانتے ہیں محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ تھوڑے سے معتبر آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر جائیں اور اس حسینہ کو راضی کر کے لائیں۔ خوشی سے آئے خوشی سے، جبر سے آئے جبر سے، اس کی پرواہ نہیں، میں ریاست کا مالک ہوں۔ اس میں جس چیز پر میری نظر ہو! اس پر کسی دوسرے شخص کا کوئی قانونی یا اخلاقی حق نہیں ہو سکتا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ میری زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اور آپ کی خوش تدبیری سے میری جان بچ گئی۔ تو آپ ہمیشہ ریاست کے محسنوں میں شمار کئے جائیں گے اور۔۔۔۔"

مسٹر مہتہ کے حوصلے سے منجمد خون میں یکا یک اُبال آیا۔ بولے "آپ کا منشار ہے میں اُسے کڈنیپ کرا لاؤں؟"

راجہ صاحب نے ان کے تیور دیکھ کر تبسم کے ساتھ کہا۔ "ہرگز نہیں۔ میں تو آپ کو اپنا معتمد سفیر بنا کر بھیجتا ہوں۔ حصول مقصد کے لئے آپ کو ہر ممکن تدبیر سے کام لینے کا اختیار ہے"۔

مسٹر مہتہ کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ "مجھ سے یہ کمینہ فعل نہیں ہو سکتا"۔

"کسی حسینہ سے شادی کی درخواست کمینہ فعل ہے؟"

"جبری اغوا و بے شک کمینہ فعل ہے"۔

"آپ اپنے ہوش میں ہیں؟"

"خوب اچھی طرح"!

"میں آپ کو خاک میں ملا سکتا ہوں"۔

"اگر آپ مجھے خاک میں ملا سکتے ہیں، تو میں بھی آپ کو خاک میں ملا سکتا ہوں"۔

"میری نیکیوں کا یہی صلہ ہے نمک حرام ...."

"آپ اب احترام کی حد سے آگے بڑھتے جاتے ہیں راجہ صاحب۔ میں نے اب تک ضمیر کا خون کیا ہے اور آپ کے ہر ایک جا اور بے جا حکم کی تعمیل کی ہے لیکن ضمیر فروشی کی بھی حد ہوتی ہے جس کے آگے کوئی بھی ذی ہوش آدمی نہیں جا سکتا۔ آپ کا فعل ایک راجہ کے شایانِ شان نہیں اور اس میں جو شخص اعانت کرے وہ قابلِ گردن زدنی ہے میں ایسے فعل پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ گھر آئے۔ اور راتوں رات سامانِ سفر درست کر کے ریاست سے نکل گئے۔ مگر اس سے قبل اس معاملہ کا کچا چٹھا ایجنٹ کے نام بھیج دیا۔

* * * * *

ختم شد

ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ

ضرب کلیم	علامہ اقبال	انتخاب کلام اکبر	اکبر الہ آبادی
بال جبریل	" "	" " حفیظ	حفیظ جالندھری
بہترین نظمیں	نریش کمار شاد	" " جوش	جوش ملیح آبادی
دست صبا	فیض احمد فیض	نقش فریادی	فیض احمد فیض
گجر	قتیل شفائی	زنداں نامہ	" "
دو جام	عبدالحمید عدم	سسرال	شوکت تھانوی
قول و قرار	" "	پرانی آگ	سعید [illegible]
رنگ و آہنگ	" "	مچلتے ارمان	" "
کلام ۔ اختر شیرانی		آخری بہار	انجم مرزا
انتخاب کلام میر	میر تقی میر	مامن کی تلاش	انور کمال حسینی
" انبال	علامہ اقبال	مہرباں کیسے کیسے	اظہار اثر
" جگر	جگر مراد آبادی	منٹو کے مختصر افسانے	سعادت حسن منٹو